دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک کا علمی و دینی مجلہ
ماہنامہ
الحق
زیر سرپرستی: شیخ الحدیث حضرۃ مولانا عبدالحق، بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور (مغربی پاکستان)

لہٗ دعوۃ الحق

قرآن وسنّت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد : ۶ — شمارہ : ۶

محرم الحرام ۱۳۹۱ھ — مارچ ۱۹۷۱ء

مدیر ــــــــ سمیع الحق

اس شمارے میں

بدل اشتراک : مغربی اور مشرقی پاکستان سے -/۸ روپے ، فی پرچہ ۷۰ پیسے
غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ ، غیر ممالک ہوائی ڈاک دو پونڈ

سمیع الحق استاد دارالعلوم حقانیہ طابع وناشر نے منظور عالم پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ آغاز

پچھلے دنوں ڈسٹرکٹ جیل راولپنڈی میں ان نو ۹ مجرموں کو پھانسی دیکر کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا، جنہوں نے گذشتہ برس موضع علی پور فراش کے ۹ افراد کو ان کی انتہائی بے کسی اور کس مپرسی کے عالم میں نہایت انسانیت سوز طریقے سے دلخراش چیخوں کے دوران زندہ جلا دیا تھا، گھر کو مقفل کر کے اس کے اردگرد پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی اور اس کے تمام مکینوں نے جن میں چار عورتیں اور ایک بچّی بھی تھی، انتہائی بے بسی کے عالم میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ فاضل عدالت کے فیصلہ کے مطابق ان بے کس مظلوم خواتین میں آٹھ ماہ کی حاملہ ایک خاتون بھی شامل تھی جو ایک خوفزدہ چوہے کی طرح کمرے میں ادھر ادھر دوڑتی رہی اور آخر کار جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا کمرہ بند ہے تو مایوس ہو کر کمرہ کے ایک بلند جگہ سے کود کر گر پڑی اور تڑپ کر جان دیدی۔ بھرا گاؤں اس بربریت کے مظاہرہ کو روکنے کیلئے کچھ نہ کر سکا۔ مجرموں نے تمام انسانی قدروں کو پائمال کرتے ہوئے ہنسی خوشی اس صدی کا یہ اندوہناک کھیل دیکھا بھائی بھائی کو اور والد اپنے جگر گوشہ بیٹے کو جلتے دیکھ رہا تھا مگر سب مظلوم اور بے بس تھے۔

بجا طور پر اس صدی کا اندوہناک حادثہ اور بدترین سزا کا مستحق جرم ہے۔ عدالت انہیں پھانسی سے زیادہ کوئی سزا دینے کی مجاز نہ تھی، ورنہ اسلامی تعزیرات اور حدود کی رُو سے انہیں زیادہ عبرتناک سزا بھی دی جا سکتی تھی انہیں زندہ جلایا جا سکتا تھا، اور تعزیراً ایسے سنگدل ظالموں کو برسرِ عام سنگسار کیا جا سکتا تھا۔ موجودہ قوانین کے علمبردار اکثر یورپی ممالک تو ایسے بدترین مجرموں کے سزائے موت کے روادار بھی نہ تھے۔ مگر اسلام کا حکم تھا کہ ایسے ننگِ انسانیت افراد کو ملک کے اہم شہروں کے چوراہوں پر سولی لٹکا دیا جاتا۔ تاکہ اوروں کے لئے یہ سانحہ ایک سبق بن سکتا۔ ولیشھد عذابھما طائفۃ من المومنین۔ یہ واقعہ اخبارات میں آیا لوگوں نے پڑھا مگر اس میں غور و فکر کے جو بے شمار سوالیہ نشان تھے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے فراموش کر دیا گیا حالانکہ تاریخ جرم و سزا کے ایسے واقعات عبرت و موعظمت کے لئے دہراتی رہتی ہے۔ یہ دلدوز واقعہ موجودہ مسلم معاشرہ کی ایک انتہائی بھیانک تصویر پیش کر رہا ہے۔

وہ ہمیں بتلا رہا ہے کہ انسان وحشت بربریت اور ذلت وحیوانیت کے کس مقام تک پہنچ گیا ہے۔؟ واقعی انسان کتنا قابل رحم ہے! چودہ سو سال قبل پوری انسانی سوسائٹی کی ایسی ہی مہیب تصویر حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے سامنے تھی نہ صرف انسان بلکہ انسانی قدروں کا ہر ذرہ اپنے مقام سے ہٹ کر نظام عالم کو تہ وبالا کر رہا تھا۔ حضورؐ نے کس حکیمانہ شان سے نقشہ سامنے رکھا اور خرابیوں کی اصلاح شروع کی۔ اس وقت ساری خرابی اور بربادی کا علاج معاشی اور اقتصادی مسائل میں سمجھا جا رہا ہے مگر ایسے وحشت اثر واقعات ہمیں جھنجھوڑ رہے ہیں کہ یہ افراتفری اور سراسیمگی صرف پیٹ کے مسائل کی پیداوار نہیں اور نہ یہی ایک نسخۂ کیمیا رہ گیا ہے، بلکہ اصل مسئلہ اب بھی انسان کو اسکی انسانیت کیطرف لوٹانا ہے، اُس کے نفس اور حیوانیت کو سدھارنا ہے، اسکی روح اور باطن کا تزکیہ کرانا ہے۔ معاش سے ہزار درجہ اہم چیز اخلاق اور معاشرت کیطرف توجہ دینی ہے اور موجودہ ہیجان اور پریشانی بھی معاش سے زیادہ اخلاقی اور معاشرتی و تمدنی مسائل ہی کی پیدا کردہ ہے۔ بگڑی طبیعت اور بُرے اخلاق بھرے پیٹ سے اور بھی بگڑ جاتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں اخلاق اور معاشرت کی طرف کتنی توجہ دی جارہی ہے۔؟ عین اسوقت کہ مشرقی پاکستان میں ۲۰ لاکھ انسانی آبادی تاریخ کے بدترین طوفان کا لقمۂ تر بن چکی ہے۔ ملک ایک رسوائے زمانہ فاحشہ عورت، شہناز اور اس کے "دوستوں" کے چرچوں سے گونج رہا ہے۔ کالج کی نوجوان طالبات اس کی آمد آمد کا سن کر ایک جھلک دیکھنے کے لئے پاگل ہو رہی ہیں۔ اُس کے گھناؤنے کردار کے فیچر تیار کرنا اخبارات کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ اور ایسے دور میں کہ ملک ایک شدید نازک آئینی بحران سے گزر رہا ہے ــــــ۔

نہ صرف ہوٹلوں میں چوری چھپے یورپ کے طرز پر حسن کی نمائش کی جارہی ہے بلکہ تعلیمی اداروں اور کالجوں میں فیلشن شو کے نام پر پورے معاشرت کی اخلاقی بربادی کو صلائے عام دی جارہی ہے۔ (دیکھئے ۲۶-۲۷ فروری کے اخبارات میں ہوم اکنامکس کالج پشاور کی ایک تقریب کی تفصیلات اور مناظر)

حضور اقدس علیہ السلام نے ہمارے سامنے اصلاح کا ایک عملی نمونہ رکھ دیا تھا۔ انہوں نے انسان کی درندگی کو بندگی اور حیوانیت کو ملکوتیت سے بدل دیا۔ اخلاق سدھر گئے معاشرہ پاک وصاف ہوا، معاشی مسائل خود بخود حل ہوگئے۔ مواسات کے جذبہ نے مساوات کی ضرورت ہی نہ چھوڑی۔ ظلم عدل سے اور وحشت الفت سے بدل گئی۔ حدود اور تعزیر کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی زیادہ

تعلیم، تربیت اور تزکیہ سے کام لیا گیا۔ انصاف اور حق رسانی کا راستہ نہایت سہل بنا دیا گیا۔ احتساب کی گرفت کڑی رکھی گئی، نتیجۃً معاشرہ تاریخ کا ایک مثالی معاشرہ بن گیا، مگر اب ۔۔؟ ساری نگاہ تری معاش پر ہے۔ معاد کا تصور تک نہیں ساری توجہ بازاری سیاست پر ہے۔ اخلاق اور معاشرت کس بلا کا نام ہے؟ تعلیم نام کسبِ معاش کا رہ گیا ہے اور اخبارات، فلم، لٹریچر، ٹیلی ویژن، ریڈیو اور ثقافت "اخلاقی قدروں" کے لحاظ سے "تعلیم" کی رہی سہی کمی پوری کر جاتی ہے۔

قصبہ علی پور کا یہ المناک سانحہ ہمیں سبق دے رہا ہے کہ تمہارے اسلاف اور تمہارے آقا اور مقتدائے اعظم علیہ السلام نے پوری دنیا کے ایسے ہی ایک معاشرہ کو کس انداز سے تحت الثریٰ سے اٹھا کر اوجِ ثریا تک پہنچا دیا تھا۔ اس آقا کے نام لیواؤ اور خیرِ امت ہونے کے دعویدارو تم پوری دنیا کو نہیں تو صرف اپنے چھوٹے سے ملک کی گرتی ہوئی انسانیت کو تھامنے کی کوشش تو کرو جو اسفل السافلین کی طرف لڑھکتی جا رہی ہے۔ علی پور کے مظلوم شہداء کی پاکیزہ ارواح تم سے بھیک مانگتے ہیں اور اس بربریت کے مرتکب ظالم قاتلوں کے روح بھی تمہیں جھنجھوڑ رہے ہیں ۔۔۔۔

★

تادمِ تحریر ملک کا آئینی بحران نازک سے نازک تر ہوتا جا رہا ہے، جس کا ایک افسوسناک پہلو یہ بھی ہے کہ ۶ نکات کے شوراشوری کے وجہ سے اسلامی آئین کا مسئلہ کچھ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ جبکہ اجلاس سے قبل اس بارہ میں نہایت گرم جوشی کی ضرورت تھی بظاہر اب تو اسلامی آئین کی بجائے نفسِ آئین بنانا ہی ایک مسئلہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیا عجب کہ دو اکثریتی پارٹیوں کے اس کھچاؤ اور اختلاف میں قدرت کو اسلامی آئین کے حق میں "خیر" کی کوئی صورت منظور ہو۔ اس اختلاف نے دونوں لیڈروں کی نگاہ میں اسلامی درد رکھنے والے ارکان کی مٹھی بھر اقلیت کی بھی اہمیت پیدا کر دی ہے۔ اور فریقین اپنے مفاد اور وقار کی خاطر سہی مگر ان ارکان کے اسلامی مطالبات کو مطلقاً نظر انداز نہیں کر سکیں گے۔ ہمارا مقصود و مطلوب تو اوّل و آخر اسلام اور اسلامی آئین ہے اگر ملک کی اکثریتی پارٹیوں کا باہمی اتحاد اور مفاہمت اس کا ذریعہ بنتا ہے تو ہم اللہ سے ہر وقت ایسے اتحاد کی دعا مانگتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی اتحاد ہمیں اسلامی آئین سے دور اور کسی لادینی یا بیرونی ازم سے قریب کر کے کسی غیر اسلامی آئین کا ذریعہ بنتا ہے تو ہم ایسے اتحاد سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اور اس صورت میں موجودہ تعطّل اور بحران کو اسلام کے حق میں ایک غیبی مدد سمجھیں گے مگر جس ذات کے قبضہ میں سارے انسانوں کے قلوب ہیں اس سے بہر حال سب کی التجا یہ ہی چاہیئے کہ ہم سب کو کلمۂ اسلام، ملک کی حقیقی بھلائی اور اتحاد و سالمیت پر متحد و متفق فرما دے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل ۔

سمیع الحق

ضبط و ترتیب: ادارۃ الحق

موجودہ مصائب اور پریشانیوں کا — علاج

(خطبۂ جمعۃ المبارک ۲۹ ذی الحجہ ۱۳۹۰ھ)

(خطبۂ مسنونہ کے بعد) اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ (الآیۃ)

محترم بزرگو! آج مسلمانوں پر قسم قسم کے مصائب ہیں، اطمینان قلب کسی کو بھی حاصل نہیں، گرانی اور تنگدستی کی شکایت موجود ہے۔ اختلاف اور بے اتفاقی کے ایک بڑے مرض میں پوری قوم مبتلا ہے۔ الغرض ایسی مصیبت اور تکلیف نہ ہوگی جس سے مسلمان محفوظ ہوں۔ ہم لوگ اپنے امراض کیلئے کوئی علاج ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ کوئی مالی حالت کی بہتری کی تجاویز پیش کرتا ہے، کوئی صنعت کی ترقی پر زور دیتا ہے۔ کوئی زرعی اصلاحات کو معاشی بہتری اور اطمینان کا سبب قرار دیتا ہے، مگر یہ چیزیں اسباب ظاہریہ کے درجہ میں تو ٹھیک ہیں مگر مصائب اور پریشانیوں کا اصل علاج ان چیزوں میں نہیں۔ اس کے لئے شریعت نے بھی علاج تجویز فرمایا ہے۔ اور وہ ہر کسی کی حالت کی بہتری اور بھلائی اس کے اعمال اور اخلاق پر موقوف ٹھہراتی ہے۔ مال و دولت کی ترقی اور دیگر اسباب ظاہریہ کے حصول سے ان امراض کا ازالہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس بات سے ہوگا کہ اپنی زندگی اللہ کی مرضی اور قانون کے مطابق کر دی جائے۔ جب تک ہم اللہ کے قانون کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے اور اپنے اعمال اخلاق کردار اور ذہن و فکر اور خیالات و نظریات کو اللہ کی مرضی پر نہ ڈھالیں گے یہ امراض اور بڑھیں گے اور بڑھتے رہیں گے۔ شریعت اور صاحب شریعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مطابق زندگی گذارنے میں دنیا کی بھی بہتری ہے اور آخرت کی بھی بھلائی ہے۔ حضورؐ کی زندگی تو ایسی تھی کہ نبوت سے قبل کی زندگی کو بھی آپ [illegible] کامیابی اور سرخروئی کا پیش خیمہ

سمجھا گیا تھا جب ابتداً وحی کا نزول ہوا اور آپ گھر تشریف لائے تو وحی کے ثقل اور ساری دنیا کو ہدایت کی ذمہ داری کے بوجھ سے دبے جا رہے تھے۔ آپ کی شان تو یہ ہے کہ وما ارسلناک الا رحمۃً للعالمین۔

تو یہ ایک عظیم ذمہ داری تھی جو آپ کے سپرد ہوئی تھی۔ ہم اپنے محلہ اور اپنے گھر کی کسی خلاف شرع بات اور رسم و رواج کو نہیں بدل سکتے اپنی اولاد اور اقارب کی اصلاح مشکل ہوتی ہے اور حضورؐ جب مبعوث ہوئے تو ساری دنیا میں شرک کفر اور جہالت کا دور دورہ تھا تو فکر ہوا کہ ایسی بڑی ذمہ داری سر پر آپڑی ہے اور خلعت بھی ایسی، نبوت کی عطا فرمائی گئی جو ختم نبوت ہے اور قیامت تک سارے عالم کی اصلاح و رہنمائی کا فریضہ سر پر ڈالتی ہے تو تشویش تھی کہ اتنا سخت کام مجھ سے پورا ہو سکے گا۔ یا نہیں اور فریضہ کی ادائیگی میں مکمل طور پر کامیاب ہو سکوں گا یا خدانخواستہ دوسری کوئی صورت پیش آئے گی حضورؐ کی اہلیہ محترمہ جو جان نثار اور مطیع و فرمانبردار ہونے کے علاوہ نہایت ذہین، فہیم اور عالمہ بھی تھیں، نے پریشانی کو دیکھ کر فرمایا کہ کلا لا یخزیک اللہ۔ اللہ آپ کو ہرگز پریشان نہیں کرے گا۔ لانک تحمل الکل۔ آپ ایسے لوگوں کے بوجھ اٹھاتے ہیں جو اپنی حاجات کو پورا کرنے سے عاجز ہوتے ہیں۔ معذور ہیں بیمار اور ناتوان و فقیر ہیں ——— وتصل الرحم۔ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں۔ صلہ رحمی اپنے ذوی القربیٰ اور رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرنا کہ اگر وہ قطع تعلق بھی کریں تو آپ نہ کریں۔

تو حضورؐ ہمیشہ صلہ رحمی فرماتے تھے۔ ارشاد ہے: صل من قطعک۔ کہ اگر کوئی تجھ سے قطع تعلق کرنا چاہے اور قرابت کا پاس نہ رکھے تب بھی آپ اسکی پرواہ نہ کریں۔ بلکہ اس کے حقوق کی ادائیگی اور امداد و معاونت اور غم و خوشی میں شریک ہوتے رہیں۔ آجکل قرابتداری کے حقوق کو یکسر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ آدمی باپ کی نافرمانی کرے گا، اور اپنے دوست کا فرمانبردار ہوگا۔ باپ سے ہمیشہ درشتی اور بداخلاقی کا سلوک ہے اور اگر دوست آیا تو سب کچھ نثار کرتا ہے۔ حضورؐ کی یہ عادت نہ تھی بلکہ بدترین دشمن بھی حسن و سلوک فرماتے، ابوجہل جیسے شخص سے بھی کہ جس نے حضورؐ کو نقصان پہنچانے کے خیال سے خود بیمار بن کر حضورؐ کو عیادت کی غرض سے اپنے گھر میں گھیر لینے کی سازش بنائی، حسن خلق کا حال معلوم تھا کہ بیماری کا سن کر بیمار پرسی کرنے ضرور آئیں گے، راستہ میں گڑھا کھود کر اوپر سے ڈھانک دیا کہ حضورؐ آتے ہوئے اس میں گر پڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعہ اس سازش کی اطلاع دی۔ واللہ یعصمک من الناس۔

کا ظہور ہوتا رہتا تھا۔ حضورؐ راستہ سے واپس ہوئے ابوجہل ہیبت زدہ ہوئے اور پریشان بھی کہ بنی بنائی سکیم ناکام ہورہی ہے اٹھ کر پیچھے بھاگ دوڑے کہ شکار ہاتھ میں آگر جارہا ہے جلدی سے اٹھے تو خود ہی اسی کنوئیں میں گر پڑے۔ چاہ کندہ را چاہ درپیش۔ حضورؐ نے اس کی چیخ و پکار سنی تو واپس ہوئے، اپنی چادر اور رسی وغیرہ کو لٹکایا اور ابوجہل کو اس گڑھے سے نکال دیا۔ یہ اخلاق نبوی تھے۔ لوگ اجنبی اور غیر رشتہ دار لوگوں سے تعلق پیدا کر لیتے ہیں کہ وہ احسان مانتا ہے مگر رشتہ دار سارے احسانات اور حسن سلوک کا سبب رشتہ کو سمجھتا ہے اور احسان کرنے والے پر اپنا زور سمجھتا ہے۔ بلکہ کہتے ہیں کہ میرے باپ یا دادا کا مال تھا، اس نے قبضہ کر رکھا تھا۔ مجھے دیا تو کیا ہوا۔ تو احسان کے جواب میں نہ شکریہ نہ دعا نہ بدلہ، ایسے مواقع پر انسان کی طبیعت احسان کرنے سے روکتی ہے کہ دوسرا تو مانتا تک نہیں اس لئے ذوی القربیٰ سے احسان بڑا مجاہدہ اور بہت زیادہ موجب اجر ہے اور اس لئے اسکی تائید حضورؐ نے بہت فرمائی ہے۔ آگے حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے یہ بھی فرمایا کہ تقری الضیف آپ مہمان اور مسافروں کی مہمانداری فرماتے ہیں۔ وتعین علی نوائب الحق۔ مصائب میں مدد کرتے ہیں۔ اور مصائب بھی دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ کسی مصیبت کو خود اپنے اوپر لاد دیا جائے۔ مثلاً چوری ڈاکہ جوا کرنے لگا ہے اور پکڑا جائے، دوسرے یہ کہ اس میں اسکی تعدی نہ ہو اور قدرت کیطرف سے آجائیں۔ سیلاب طوفان یا دیگر آفات سماوی۔ تو ایسے مصائب میں لوگوں کی مدد کرنا حضورؐ کا شیوہ تھا۔ اس میں حضورؐ کے قبل از نبوت زندگی اور سیرت پر بھی روشنی پڑ گئی اور یہ کہ جب ایسی پاکیزہ زندگی گذاری جائے گی تو دنیا میں کامیابی ہی کامیابی ہوگی۔

الغرض کامیابی کا راز عبادت اور اخلاق و اعمال صاحب شریعت کی پیروی میں ہے۔ اور مصائب کا ازالہ بھی نیک اعمال اور عبادات ہی سے ہوسکتا ہے ورنہ اگر دولت بہت زیادہ ہے مگر دل ہر وقت غمزدہ ہے، مصائب اور مقدمات میں مبتلا ہے تو کیا ہے۔؟ اور اگر ایک پیسہ بھی نہیں ہے مگر خوش و خرم ہے اس لئے کہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ اللہ سے لگاؤ ہے تو دل مطمئن ہے۔

تو ایسی غریبی اور تنگدستی سے کیا تکلیف ہوسکتی ہے۔ ہر زمانہ میں نیکیوں اور اعمال صالحہ کا نتیجہ مصائب کے ازالہ کی شکل میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ بنی اسرائیل کے تین افراد سخت آفت اور سیلاب میں گر گئے۔ ایک غار میں پناہ لی اور ایک بھاری اور بہت بڑی چٹان غار کے منہ پر گر گئی اور غار کا منہ بالکل ڈھک گیا۔ سخت پریشان تھے کہ اب کیا ہوگا، ادھر باہر بھی کسی کو علم نہیں نہ

اپنے نہ پرائے، اگر پتہ لگ بھی جاتا تو اس وقت ایسی مشین، کرین اور آلات تو تھے نہیں کہ اتنی بڑی چٹان ہٹادی جاتی، یقین ہوگیا کہ اب ایڑیاں رگڑ رگڑتے مریں گے۔
بھائیو! اتنا سوچا کرو کہ ایسی حالت سب پر آئے گی۔ قبر میں ایسا ہی حال ہوگا۔ مضبوط تختے لگوا کر سینکڑوں من مٹی اوپر سے ڈالدی جائے گی۔ اب نہ وہاں ماں ہوگی نہ باپ نہ اولاد نہ بھائی نہ بیوی نہ کوئی اور مددگار، تاریکی ہی تاریکی اور تنہائی ہوگی۔ تو سوچا کرو کہ برزخ کی وہ زندگی کیسے گزرے گی اور کیا حال ہوگا۔؟ تو یہ تینوں ساتھی جب زندہ درگور ہوگئے تو ہر ایک نے مصائب کے ازالہ کیلئے اللہ سے دعا کی اور عبادات کا وسیلہ پکڑا اور عبادت کے بعد دعا اثر رکھتی ہے۔ واذا فرغت فانصب۔ امام بخاریؒ اسکی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو رجوع کرو اللہ کیطرف اور اللہ سے مانگو، اس لئے کہ عبادت کے بعد دعا قبول ہوتی ہے —— وہ تینوں عامی لوگ تھے، نہ قطب نہ ابدال نہ غوث نہ ولی نہ عالم مگر ایسے سخت حالات میں گھر کر بڑی اچھی تدبیر سوجھی اور ہمارے ہاں اب بھی بڑے بوڑھے لوگ سخت وقت کیلئے دس بیس روپیہ پس ماندہ رکھتے ہیں کہ کام آسکیں گے۔ اور اگر کوئی لگانے پر مجبور کر دے تب بھی کہتے ہیں کہ نہیں سخت وقت میں کام دیں گے۔ تو ایسے ہی ہر مسلمان کو رات کے وقت جب لحاف اوڑھ کر سونے لگتا ہے تو سوچنا چاہئے کہ میرے پاس عمل کا ایسا سرمایہ کونسا ہے جسے نازک وقت میں اللہ کے دربار میں وسیلہ بنا سکوں گا، جیب میں کچھ ہے بھی یا بالکل خالی پھر کسی چیز سے سخت وقت گذارو گے۔ بہر حال ایک نے والدین سے نیکی اور حسن سلوک کے عمل کو پیش کر دیا کہ ایک دفعہ سخت آزمائش میں رات بھر والدین کی خدمت کو اولاد پر ترجیح دی اور جاگتا رہا —— اس دعا سے چٹان کا ایک تہائی حصہ نیچے سرک گیا۔ تازہ ہوا آنے لگی۔ دوسرے شخص نے جوانی، محبت اور شدید تکالیف کے بعد محبوبہ سے مل جانے کی صورت میں اسکی نصیحت اور منع کرنے پر برے ارادہ کو چھوڑ دیا تھا، اسکی آواز سنی کہ اللہ سے ڈرو اور ندامت کرو تو قدرت کے باوجود ہٹ گیا۔ اس عمل کے طفیل دعا مانگی، پتھر ایک تہائی اور سرک گیا پھر تیسرے شخص نے دعا مانگی جس نے کسی مزدور کو اجرت نہ دے سکنے کی صورت میں اسکی اجرت کے اناج کو زمین میں بویا کاٹا یہاں تک کہ کئی سال میں بڑھتے بڑھتے وہ معمولی اجرت بہت بڑی مال و دولت کی شکل میں جمع ہوگیا اور مزدور جب آیا تو حیرت میں رہ گیا۔ اس عمل کے صدقے سے اللہ سے دعا مانگی تو یکدم باقی چٹان بھی راستے سے ہٹ گئی اور یہ سب زندہ سلامت نکل گئے۔ —— تو یہ سب کام اللہ کی رضا کیلئے تھے۔ گویا مشینوں اور کرینوں کا کام ان اعمال صالحہ نے دیا!

حدیث میں ہے کہ قبر میں دائیں طرف نماز، بائیں طرف روزہ، سرہانے قرآن مجید، قدموں کیطرف صدقہ اور خیرات سپر اور ڈھال بن جائیں گے۔

حضورؐ نے دعا فرمائی کہ میری امت سب کی سب کافروں کی غلام نہ بن جائے۔ سب کے سب قحط میں مبتلا ہو کر مٹ نہ جائے۔ یہ دعائیں قبول ہوئیں مگر باہمی خانہ جنگی اور اختلاف سے بچائے رکھنے کی دعا قبول نہ ہوئی کہ کچھ تو بُرے اعمال کی سزا ملتی رہے اور یہ سزا بھی آخرت کے مستقل عذاب کے لئے کچھ کفارہ بنتی رہے گی

اب اعمال بے حد خراب ہو رہے ہیں تو پوری امت باہمی سر پھٹول میں لگی ہوئی ہے۔ پورا ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہے۔ قوم اور رعایا، باپ بیٹا، بھائی بھائی سب آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا کو سب بھول گئے ہیں۔

الغرض حالات کی درستگی اعمال سے ہوتی ہے۔ اسباب اور وسائل سے نہیں اور اعمال بھی وہ جو حضورؐ کی سیرت اور اللہ کے فرامین کے مطابق ہوں۔ ہر مشین اور دوائی کے استعمال کا طریقہ بھی اس کے بنانے والا بتلاتا ہے۔ غلط استعمال بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔ تو ہمارے جسم کی مشین بھی اس کے بنانے والے کی ہدایات ہی پر صحیح کام کر سکتا ہے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

مولانا مشاہد علیؒ کی وفات

پاک و ہند کے مایہ ناز عالم دین، حضرت مولانا مشاہد علی صاحب جلال آبادی ۸ر فروری کو حرکت قلب بند ہونے سے انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا مرحوم نے دارالعلوم دیوبند اور سہارن پور میں تعلیم حاصل کی پھر اپنے وطن کنائی گھاٹ میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، اور وہیں دین کی خدمت کر رہے تھے۔ بہت بڑے محدث اور بزرگ تھے، معتمد علیہ لیڈر تھے، علوم دینیہ میں گویا یکتائے زمان تھے۔ آپ کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس خلاء کو پُر کر دے۔

آپکی رحلت کی خبر ملتے ہی دفتر صوبائی جمعیۃ علماء اسلام مشرقی پاکستان میں ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا جس میں مرحوم کے اہل و عیال سے تعزیت اور مرحوم کی مغفرت کیلئے دعا کی گئی۔

محمد عبدالجبار۔ ناظم دفتر جمعیۃ العلماء اسلام
مشرقی پاکستان

قسط ۳ — جناب وحید الدین خان

قانون سازی کا حق کسے حاصل ہے؟

یہاں میں چند مثالیں دوں گا جس سے اندازہ ہوگا کہ یہ دعویٰ کس قدر صحیح ہے کہ صرف خدائی مذہب ہی وہ حقیقی بنیاد ہے جس سے ہم انسانی زندگی کا قانون اخذ کر سکتے ہیں۔

معاشرت اسلام کی نظر میں عورت مرد دونوں برابر نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے دونوں صنفوں کے درمیان آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے۔ اور اس کو بند کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد جب سائنسی دور شروع ہوا تو اس اصول کا بہت مذاق اڑایا گیا۔ اور اس کو دورِ جہالت کی یادگار قرار دیا گیا۔ بڑے زور شور سے یہ بات کہی گئی کہ عورت مرد دونوں یکساں ہیں۔ اور دونوں مساوی طور پر نسلِ انسانی کے وارث ہیں۔ ان کے میل جول کے درمیان کوئی دیوار کھڑی کرنا ایک جرم عظیم ہوگا۔ چنانچہ ساری دنیا میں اور خاص طور سے مغرب میں اس اصول پر ایک نئی سوسائٹی ابھرنا شروع ہوئی۔ مگر طویل تجربے نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ پیدائشی طور پر دونوں یکساں نہیں ہیں، اس لئے دونوں کو یکساں فرض کرکے جو سماج بنایا جائے وہ لازمی طور پر بیشمار خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوگا۔

پہلی بات یہ کہ عورت اور مرد میں فطری صلاحیتوں کے زبردست نوعی اختلافات ہیں۔ اس لئے دونوں کو مساوی حیثیت دینا اپنے اندر ایک حیاتیاتی تضاد رکھتا ہے۔ ڈاکٹر الکسس کیرل عورت اور مرد کے فعلیاتی (PHYSIOLOGICAL) فرق کو بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

"مرد اور عورت کا فرق محض جنسی اعضا کی خاص شکل، رحم کی موجودگی، حمل یا طریقۂ تعلیم ہی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ اختلافات بنیادی قسم کے ہیں۔ خود نسیجوں کی بناوٹ اور پورے نظامِ جسمانی کے اندر خاص کیمیائی مادے جو خصیۃ الرحم سے مترشح ہوتے رہتے ہیں، ان اختلافات کا حقیقی باعث ہیں صنفِ نازک کی ترقی کے حامی ان بنیادی حقیقتوں سے ناواقف ہونے کی بنا پر یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں جنسوں کو ایک

ہی قسم کے اختیارات اور ایک ہی قسم کی ذمہ داریاں ملنی چاہئیں حقیقت یہ ہے کہ عورت مرد سے بالکل ہی مختلف ہے۔ اس کے جسم کے ہر ایک خلیے میں زنانہ پن کا اثر موجود ہوتا ہے۔ اس کے اعضا اور سب سے بڑھ کر اس کے اعصابی نظام کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ فعلیاتی قوانین (PHYSIOLOGICAL LAWS) اتنے ہی اٹل ہیں جتنے کہ فلکیات (SIDEREAL WORLD) کے قوانین اٹل ہیں۔ انسانی آرزوں سے ان کو بدلا نہیں جاسکتا۔ ہم ان کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہیں جسطرح وہ پائے جاتے ہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ اپنی فطرت کے مطابق اپنی صلاحیتوں کو ترقی دیں اور مردوں کی نقالی کرنے کی کوشش نہ کریں۔ (MAN THE UNKNOWN, P-93)

عملی تجربہ بھی اس فرق کی تصدیق کر رہا ہے۔ چنانچہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی اب تک عورت کو مرد کے برابر درجہ نہ مل سکا۔ حتیٰ کہ وہ شعبے جو خاص طور پر عورتوں کے شعبے سمجھے جاتے ہیں، وہاں بھی مرد کو عورت کے اوپر فوقیت حاصل ہے۔ میری مراد فلمی ادارے سے ہے، نہ صرف یہ کہ فلمی اداروں کی تنظیم تمام تر مردوں کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ اداکاری کے اعتبار سے بھی مرد کی اہمیت عورت سے زیادہ ہے۔ چنانچہ آج ایک مشہور ترین فلم ایکٹر ایک فلم کے لئے چھ لاکھ روپے لیتا ہے جبکہ مشہور ترین فلم ایکٹرس کو چار لاکھ ملتے ہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ اگر ہم طبیعی اور فلکیاتی قوانین کو تسلیم نہ کریں اور ان کے خلاف چلنا شروع کر دیں تو یہ صرف ایک واقعہ کا انکار ہی نہیں ہوگا بلکہ ہمارا سر بھی ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح عورت اور مرد کی جداگانہ حیثیات کو نظر انداز کر کے انسان نے جو نظام بنایا۔ اس نے تمدن کے اندر زبردست خرابیاں پیدا کر دیں۔ مثال کے طور پر اس غلط فلسفے کی وجہ سے دونوں صنفوں کے درمیان جو آزادانہ اختلاط پیدا ہوا ہے، اس نے جدید سوسائٹی میں نہ صرف عصمت کا وجود باقی نہیں رکھا۔ بلکہ ساری نوجوان نسل کو طرح طرح کی اخلاقی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آج مغربی زندگی میں یہ بات عام ہے کہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی ڈاکٹر کے کمرہ میں داخل ہوتی ہے۔ اس کو سر درد اور بے خوابی کی شکایت ہے۔ وہ کچھ دیر اپنی ان تکالیف پر گفتگو کرتی ہے۔ اس کے بعد ایک مرد کا ذکر شروع کر دیتی ہے جس سے ابھی وہ جلد ہی ملی تھی۔ اتنے میں ڈاکٹر محسوس کرتا ہے کہ وہ کچھ رک رہی ہے۔ تجربہ کار ڈاکٹر اس کی بات سمجھ کر آگے بات شروع کر دیتا ہے۔

WELL, THEN HE ASKED YOU TO HIS FLAT. WHAT DID YOU SAY—?

لڑکی جواب دیتی ہے :

HOW DID YOU KNOW ? I WAS JUST GOING TO TELL YOU THAT !

اس کے بعد لڑکی جو کچھ کہتی ہے، اس کو ناظرین خود قیاس کر سکتے ہیں۔ چنانچہ علمائے جدید خود بھی اس تلخ تجربے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ آزادانہ اختلاط کے بعد عصمت وعفت کا تحفظ ایک بے معنی بات ہے۔ چنانچہ اس کے خلاف کثرت سے مضامین اور کتابیں شائع کئے جا رہے ہیں، ایک مغربی ڈاکٹر کے الفاظ میں :

THERE CAN COME A MOMENT BETWEEN A MAN AND A WOMAN WHEN CONTROL AND JUDGEMENT ARE IMPOSSIBLE.

یعنی اجنبی مرد اور اجنبی عورت جب باہم آزادانہ مل رہے ہوں تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب فیصلہ کرنا اور قابو رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کی خرابیوں کو مغرب کے دردمند افراد شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ اس سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اصل بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ ایک نہایت قابل اور مشہور خاتون ڈاکٹر میرین ہلیرڈ نے آزادانہ اختلاط کے خلاف سخت مضمون لکھا ہے، وہ کہتی ہیں :

AS A DOCTOR, I DONT BELIEVE THERE IS SUCH A THING AS PLATONIC RELATIONSHIP BETWEEN A MAN AND A WOMAN WHO ARE ALONE TOGETHER A GOOD DEAL.

یعنی بحیثیت ڈاکٹر میں اسے تسلیم نہیں کر سکتی کہ عورت اور مرد کے درمیان بے ضرر تعلقات بھی ممکن ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہی خاتون ڈاکٹر لکھتی ہیں :

"میں اتنی غیر حقیقت پسند نہیں ہو سکتی کہ یہ مشورہ دوں کہ نوجوان لڑکے اور نوجوان لڑکیاں ایک دوسرے کا بوسہ لینا چھوڑ دیں، مگر اکثر مائیں اپنی لڑکیوں کو اس سے آگاہ نہیں کرتیں کہ بوسہ صرف اشتہا پیدا کرتا ہے نہ کہ وہ جذبات کو تسکین دیتا ہے۔"

(ریڈرز ڈائجسٹ دسمبر ۱۹۵۷ء)

خاتون ڈاکٹر یہ کہہ کر بالواسطہ طور پر خدائی قانون کو تسلیم کرتی ہے کہ آزادانہ اختلاط کے ابتدائی مظاہر جو مغربی زندگی میں نہایت عام ہیں وہ جذبات میں ٹھہراؤ پیدا نہیں کرتے، بلکہ اشتہا کو بڑھا کر مزید تسکین نفس کی طرف دھکیلتے ہیں، اور بالآخر انتہائی جنسی جرائم تک پہنچا دیتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اس کی سمجھ

میں نہیں آتا کہ اس محرک شیطنت کو کس طرح حرام قرار دے۔

۲۔ اسی طرح اسلام میں ایک سے زیادہ شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس کو بھی تہذیب جدید نے بڑے زور شور کے ساتھ جہالت کا قانون قرار دیا ہے۔ مگر تجربے نے ظاہر کر دیا ہے کہ اسلام کا یہ اصول انسانی فطرت کا عین تقاضا ہے۔ کیونکہ چند زوجیت کے قانون کو ختم کرنا دراصل درجنوں غیر قانونی زوجیت کا دروازہ کھولنا ہے۔

یہاں میں اقوام متحدہ کے ڈیموگرافک سالنامہ ۱۹۵۹ء کا حوالہ دوں گا۔ اس میں اعداد و شمار کے ذریعہ بتایا گیا ہے۔ کہ جدید دنیا میں جو صورت حال ہے۔ وہ یہ کہ بچے "اندر سے کم اور باہر سے زیادہ" پیدا ہو رہے ہیں۔ ڈیموگرافک سالنامہ کے مطابق ان ملکوں میں حرامی بچوں کا تناسب ساٹھ فیصدی ہے، اور بعض ممالک مثلاً پناما میں تو چار میں سے تین بچے پادریوں کی مداخلت یا سول میرج رجسٹری کے بغیر ہی پیدا ہو رہے ہیں، یعنی ۷۵ فیصدی حرامی بچے۔ لاطینی امریکہ میں اس قسم کے بچوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

متحدہ اقوام کے اس ڈیموگرافک سالنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم ملکوں میں حرامی بچوں کی پیدائش کا تناسب نفی کے برابر ہے، چنانچہ اس میں بتایا گیا ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) میں ناجائز بچوں کا تناسب ایک فیصدی سے بھی کم ہے۔ جبکہ متحدہ عرب جمہوریہ تمام مسلم ملکوں میں شاید سب سے زیادہ مغربی تہذیب سے متاثر ہوا ہے۔ مسلم ممالک دور جدید کی اس عام وبا سے محفوظ کیوں ہیں۔ اس کا جواب متحدہ اقوام کا سالنامہ مرتب کرنے والے ایڈیٹروں نے یہ دیا ہے کہ چونکہ مسلم ممالک میں چند زوجیت (POLYGAMY) کا رواج ہے۔ اس لئے وہاں ناجائز ولادتوں کا بازار گرم نہیں ہے۔ چند زوجیت کے اصول نے مسلم ملکوں کو وقت کے اس طوفان سے بچا لیا ہے۔ ("MOVE OUT THANIN" مطبوعہ ہندوستان ٹائمس ۱۱ ستمبر ۱۹۷۰ء)

اس طرح تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ سابق خدائی اصول ہی زیادہ صحیح اور مبنی بر حقیقت تھا۔

تمدن | اسلام میں قتل عمد کی سزا موت ہے الا یہ کہ مقتول کے ورثاء خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں۔ لیکن جدید دور ترقی میں جہاں مذہب کی اور تعلیمات کے خلاف ذہن پیدا ہوا کسی طرح سزائے قتل کے بارے میں بھی سخت تنقیدیں کی جانے لگیں۔ ان حضرات کا خاص استدلال یہ ہے کہ اس قسم کی سزا کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایک انسانی جان کے ضائع ہونے کے بعد دوسری انسانی جان کو بھی کھو دیا جائے۔ پچھلے برسوں میں اکثر ملکوں میں اس رجحان نے بڑی تیزی سے ترقی کی ہے اور پھانسی کی بجائے قید کی سزائیں تجویز کی جا رہی ہیں ــــــ۔

اسلام نے قاتل کی جو سزا مقرر کی ہے اس میں دو اہم ترین فائدے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک شخص نے

سوسائٹی کے ایک فرد کو قتل کر کے جس برائی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسکی جڑ آئیندہ کے لئے کٹ جائے۔ مجرم کا یہ عبرتناک انجام دیکھ کر دوسرے لوگ آئیندہ اس قسم کی ہمت نہ کر سکیں۔ اسی کے ساتھ دیت کی جو صورت ہے اس میں گویا اسلام نے نتائج کا لحاظ کیا ہے ـــــ مثلاً اگر کسی کے والدین بوڑھے ہوں اور ان کا اکلوتا بیٹا قتل ہو جائے تو وہ بے سہارا رہ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں قاتل کو سزائے موت بھی مل جائے تو انہیں کیا فائدہ۔ اسلام نے ایسے والدین کی تلافی کے لئے یہ طریقہ رکھا ہے کہ قاتل کے ورثار مقتول کے والدین کو ایک خاص رقم بطور خون بہا دے کر انہیں راضی کر لیں۔ اور وہ قتل کو معاف کر دیں۔ اس صورت میں مقتول کے بوڑھے والدین کو مثلاً دس ہزار روپے کی رقم مل جائے گی۔ اور وہ اس رقم سے اپنی گزر بسر کا انتظام کر سکیں گے۔ مخصوص حالات میں ریاست کو بھی یہ حق ہے کہ وہ دیت کی رقم میں اضافہ کر دے تاکہ بے سہارا ورثار خسارے میں نہ رہیں۔

یہ ایک نہایت حکیمانہ قانون ہے۔ اور اس کا تجربہ بتاتا ہے کہ وہ جہاں رائج ہوا قتل کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے برعکس جن ممالک میں سزائے موت کو منسوخ کیا گیا ہے۔ وہاں جرائم گھٹنے کی بجائے اور بڑھ گئے ہیں۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ ایسے ممالک میں قتل کی وارداتوں میں بارہ فیصدی تک اضافہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ اسکی بھی مثالیں موجود ہیں کہ پہلے سزائے موت کو منسوخ کیا گیا، اور اس کے بعد نتائج دیکھ دوبارہ اسے بدل دیا گیا۔ سیلون اسمبلی نے ۱۹۵۶ء میں ایک قانون پاس کیا جس کے مطابق سیلون کی حدود میں موت کی سزا کو ختم کر دیا گیا۔ اس قانون کے نفاذ کے بعد سیلون میں جرائم تیزی سے بڑھنا شروع ہو گئے۔ ابتداً لوگوں کو ہوش نہیں آیا، مگر ۲۶ر ستمبر ۱۹۵۹ء کو جب ایک شخص نے سیلون کے وزیر اعظم بندرا نائک کے مکان میں گھس کر نہایت بیدردی کے ساتھ ان کو قتل کر دیا تو سیلون کے قانون سازوں کی آنکھ کھلی اور وزیر اعظم کی لاش کو ٹھکانے لگانے کے فوراً بعد سیلون اسمبلی کا ایک ہنگامی اجلاس ہوا جس میں چار گھنٹے کے بحث و مباحثہ کے بعد یہ اعلان کیا گیا کہ سیلون کی حکومت ۱۹۵۶ء کے قانون کو منسوخ کر کے ملک میں سزائے موت کو دوبارہ جاری کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ■■

مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ

توحید اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نظروں میں

اس وقت ایک عالم کا عالم اہلِ حکومت اور اہلِ دولت کے دامن سے وابستہ تھا۔ لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا۔ اسباب کو ارباب کا درجہ دیدیا گیا تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا۔ ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں:

"کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ ایک بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعب و داب دل ہلا دینے والا ہے۔ ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست، پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری، بہاؤ بہت زوروں پر ہے، لٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر، کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، اب ان میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس لٹکے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے۔ تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہوگا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر ہٹالے، اور اس سے خوف و امید ترک کر دے، اور لٹکے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے۔ کیا جو شخص ایسا کرے، عقل کے نزدیک بے عقل، بے ادراک، دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد

گمراہی اور ایمان کے بعد کفر سے۔ (رموز الغیب ترجمہ فتوح الغیب ۔ مقالہ ۱۷)

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور ماسوائے اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:

" اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے۔ اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے۔ اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا، اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا۔ اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کریگا، تم کو تمہاری سڑاہند اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار و رفیقانِ گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفیس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت؟ کب تک خلق؟ کب تک خواہش؟ کب تک رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم (اس خدا کو چھوڑ کر) جو ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور بنانے والا ہے۔ اوّل ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت، روحوں کا اطمینان، گرانیوں سے سبکدوشی، بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف ہے، اور اسی کیطرف سے اس کا صدور ہے۔ (رموز الغیب مقالہ ۴۲)

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح واشگاف بیان فرماتے ہیں:

" ساری مخلوق عاجز ہے، نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے، نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اس کو اس کے ہاتھوں کرا دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرّف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے، اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جو موحد اور نیکو کار ہیں۔ وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجّت ہیں۔ بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، وہ گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالیٰ ان کے اندرون پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہوا اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی۔ وہی بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر

کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا۔ اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے۔ شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے۔ اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔ (فیوض یزدانی ترجمہ الفتح الربانی مجلس ۱۳)

معبودان باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پہ، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پہ، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر۔ ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے وہ تیرا معبود ہے۔ اور ہر وہ شخص جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے تو وہ تیرا معبود ہے۔ (فیوض یزدانی مجلس ۲۰)

ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکاء سے نفرت اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے، میں جس سے محبت کرتا ہوں اس سے میری محبت رہنے نہیں پاتی اور رخنہ پڑ جاتا ہے، یا تو جدائی ہو جاتی ہے یا وہ مر جاتا ہے۔ یا رنجش ہو جاتی ہے۔ اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب، اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا اور تم غیر کے ہو رہنا چاہتے ہو، کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اور وہ اُسے اور یہ ارشاد کہ میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اُسے مبتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اُسے رکھ چھوڑتا ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے۔؟ فرمایا: اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا۔ اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اُسے اُن کی محبت بھی

رہے گی، اور خدا سے جو محبت اُسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی۔ اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا۔ وہ غیور ہے اور ہر چیز پر غالب و زبردست۔ تو وہ اپنے شریک کو ہلاک و معدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کرے، خاص اپنے لئے بغیر کسی شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ لوگ اُسے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل وعیال، دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت وریاست کرامات و حالات، منازل و مقامات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب سے پاک وصاف ہو جاتا ہے، تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی، اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی رقیق چیز نہیں ٹھہرتی۔ کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے۔ جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے۔ خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت وہیبت کے پردے ڈال دئے جاتے ہیں اور اس کے گرد اگر د کبریائی اور سطوت کی خندقیں کھود دی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا۔ اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل وعیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضر نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ اُن سے غیرت نہیں کرتا۔ بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لیے بطور لطف وکرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں، اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں انہیں نفع پہنچانے کے لئے۔ (رموز الغیب مقالہ - ۳۲)

شکستہ دلوں کی تسکین | حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست، لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا۔ اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست، لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا اور اپنے کو کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا۔ حضرت شیخ اس دل شکستہ طبقہ کی دلجوئی فرماتے ہیں اور اس پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات

ہیں۔ ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:

" اے خالی ہاتھ فقیر، اے وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے، اے گمنام، اے بھوکے پیاسے ننگے، جگر جلے ہوئے، اے ہر مسجد و خرابات سے نکالے ہوئے، اے ہر در سے پھٹکارے ہوئے۔ اے وہ کہ ہر مراد سے محروم خاک پر پڑا ہے۔ اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور ارمانوں کے (کشتوں کے) پشتے لگے ہیں۔ مت کہہ کہ خدا نے مجھے محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا، اور جمعیت (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، مجھے گمنام کیا، اور خلق میں اور میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا اور غیر پر اپنی تمام نعمتیں نچھاور کر دیں، جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں۔ اسے مجھ پر اور میرے دیار والوں پر فضیلت دی حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے، اور میں بھی، اور ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد میں دونوں ہیں۔ (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہے کہ تیری سرشت مثل زمین (کے مثل) ہے ریت ہے، اور رحمت حق کی بارشیں برابر تجھ پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے انوار تیرے گرد اگرد ہیں، تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیج اپنی جگہ پہ مضبوط ہے، کلے دے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ دے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمو میں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھاد دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے۔ (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبیٰ میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں، نہ کان نے سنیں، نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے۔ اس کام کے بدلہ میں جو وہ کرتے رہے ہیں، یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے احکام کی بجا آوری، ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے ـــ۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت

دنیا دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ ریتلی اور پتھریلی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا دقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو اور وہ کھاد دنیا اور اس کا سامان ہے، تاکہ اس سے درخت ایمان اور نہال اعمال کی جو اس زمین میں اُگے ہیں، حفاظت ہو، اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کردی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے۔ اور پھل جاتے رہیں گے۔ پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اے فقیر! دولتمند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے۔ اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے۔ اس کی مضبوطی اور اس کا ٹکاؤ انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں۔ اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کردی جائیں تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا۔ البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دولتمند کیطرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے، اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تونگری اور نعمتوں کے علیحدہ ہو جانے کی نہ پرواہ رہے گی۔ (رموز الغیب، مقالہ ۲۵)

دنیا کی صحیح حیثیت | حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس سے بقدر ضرورت انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اسکی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں، ان کے مواعظ درحقیقت حدیث نبوی" انّ الدنیا خلقت لکم وانّکم خلقتم للآخرۃ" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی (یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر ہیں، ایک موقع پر فرماتے ہیں:

"دنیا میں سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ بیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو، بلکہ اس کو بادشاہ کے دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہوا ہو، اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی ہے اسکی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے۔ اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے، اس کو ذلیل کرتی ہے، کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تونگری کے قدم پر"

حضرت علامہ شمس الحق افغانی مدظلہ

ختم نبوّت کا مسئلہ اسلامی تاریخ کے کسی دور میں مشکوک و مشتبہ نہیں رہا اور نہ اس پر بحث کی ضرورت سمجھی گئی لیکن برصغیر پاک و ہند میں انگریزی حکومت نے اپنے مفاد اور تاریخی اسلام دشمنی کی تکمیل کے لئے اسلام کے اس مرکزی عقیدہ پر ضرب لگانا ضروری سمجھا۔ تاکہ مسلمانوں کی وحدت کو ختم کیا جائے۔ اس سازش کی تکمیل کے لئے انگریزوں کو پنجاب کے ضلع گورداسپور سے ایک ایسا شخص ہاتھ آیا جو اس مقصد کی تکمیل کے لئے موزوں تھا۔ اس نے انگریزوں کی حمایت کے تحت اپنی امت بنائی اور نئی نبوّت کی بنیاد ڈالی، اور بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان کتابوں کے بنیادی مقصد تین ہیں؛

۱۔ اپنی شخصیت اور دعاوی پر زور دینا۔
۲۔ تحریفاتِ قرآن کو معارف بتلانا۔
۳۔ مسلمانوں کی دشمنی اور انگریزوں کی دوستی پر زور صرف کرنا۔

یہی اسکی ساری کارروائی کا خلاصہ ہے۔ بقول اقبال مرحوم۔ ؏

سلطنتِ اغیار را رحمت شمرد ـــــ رقصہائے گردِ کلیسا کرد و مرد

اس لئے ناواقف مسلمانوں کے ایمان بچانے کے لئے ضروری ہوا کہ ختم نبوّت پر کچھ عرض کریں۔ اسلام کو ایک عمارت سمجھو اور اہم عمارت کے تین نقشے ہوتے ہیں۔ جن کو انجینئر مرتب کرتا ہے۔

۱۔ ذہنی و فکری نقشہ ـــ ۲۔ تحریری و کتابی نقشہ ـــ ۳۔ خارجی نقشہ

اسلام عقائد، اخلاق و عبادات کی ایک عمارت تھی جسکا پورا نقشہ علم الٰہی میں منضبط تھا۔ پھر اس نقشہ کو کتاب و سنّت میں منضبط کیا گیا۔ جو عمارت اسلام کی گویا تحریری شکل تھی۔ پھر مسلمانوں کا تقریباً چودہ سو سال کا مسلسل عمل اس نقشہ اور عمارتِ اسلام کا خارجی وجود تھا۔ یہ تینوں وجود باہمی متفق ہوتے آئے

میں۔ اللہ کے علم میں اسلام کی جو حقیقت تھی وہ ہی قرآن و حدیث میں نمودار ہوئی، اور قرآن و حدیث میں اسلام کی جو حقیقت تھی وہی مسلمانوں کے ذہن و فکر میں متواتر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی گئی۔ اسلام کے بنیادی امور میں مسلمانوں نے اختلاف نہیں کیا۔ اگرچہ دیگر امور میں اختلاف رہا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بہت فرقے پیدا ہوئے لیکن آج تک انہوں نے ختمِ نبوت کی بنیادی حقیقت میں کسی قسم کا اختلاف نہیں کیا۔ البتہ اسلام اور اسلام کے سرچشموں یعنی کتاب و سنت سے الگ ہو کر انکار کیا جا سکتا تھا۔ اور کیا گیا۔ اب ہم اس مسئلہ پر دو پہلوؤں سے بحث کریں گے۔

۱۔ نقل ۲۔ عقل

نقل میں تین امور زیرِ بحث آئیں گے۔ ۱۔ کتاب یعنی قرآن اور ختمِ نبوت

۲۔ حدیث اور ختمِ نبوت۔ ۳۔ اجماع اور ختمِ نبوت

اس کے بعد ختمِ نبوت کے عقلی پہلو کو بیان کریں گے۔

۱۔ قرآن اور ختمِ نبوت | قرآن حکیم کی ایک سو سے زائد آیات میں مسئلہ ختمِ نبوت بیان کیا گیا ہے۔ ہم نظر بہ اختصار چند آیات کا انتخاب کرتے ہیں۔ پہلی آیت ختمِ نبوت ہے جو سورۂ احزاب میں ہے۔ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمًا۔ یہ آیت بالخصوص ختمِ نبوت پر دال ہے۔ ترجمہ یہ ہے: محمدؐ باپ نہیں کسی کا تمہارے مردوں میں سے لیکن رسول ہے اللہ کا اور مہر سب نبیوں پر۔ یعنی آپ کی تشریف آوری سے نبیوں کے سلسلے پر مہر لگ گئی۔ اب کسی کو نبوت نہیں دی جائے گی۔ بس جن کو ملنی تھی مل چکی اس لئے آپ کی نبوت کا دور سب نبیوں کے بعد رکھا جو قیامت تک چلتا رہے گا۔ حضرت مسیح علیہ السلام بھی آخری زمانے میں بحیثیت آپ کے ایک امتی کے آئیں گے جیسے تمام انبیاء اپنے اپنے مقام پر موجود ہیں، مگر ششِ جہت میں عمل صرف نبوتِ محمدیہ کا جاری و ساری ہے۔ اور اللہ سب چیزوں کو جاننے والا ہے۔ یعنی یہ بھی جانتا ہے۔ کہ زمانہ ختمِ نبوت اور محل ختمِ نبوت کونسا ہے۔ خاتم تار کے کسرہ کے ساتھ اکثر قرار کی قرارت ہے اور فتح تار کے ساتھ حسن و عاصم کی قرارت ہے۔ پہلی قرارت کے بموجب خاتم النبیین کا معنی سب نبیوں کو ختم کرنے والا اور فتح والی قرارت کا معنی سب نبیوں پر مہر۔ دونوں قراتوں کا مطلب ایک ہے وہ یہ کہ آپؐ آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد عطاء نبوت کا دروازہ بند ہے۔ کیونکہ مہر کا معنی بندشِ نبوت بیان کرنے کا ایک بلیغ پیرایہ ہے، جس پر خود قرآن، سنت، لغتِ عربیہ متفق ہیں۔ قرآن نے اُن کا فردں کے

متعلق جن کے نصیب میں ایمان نہیں تھا، ان کے حق میں بندش ایمان کو بلفظ مہر بیان کیا۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۔ ط

یقیناً کچھ خاص لوگ ایسے کافر ہیں کہ خواہ تو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہیں لائیں گے کیونکہ مہر لگ چکی ہے ان کے دلوں اور کانوں پر۔ (البقرہ: ۶-۷)

اگر مہر کی تعبیر سے یہاں ایمان کا دروازہ بند ہوا تو آیت خاتم النبیین میں نبوت کا دروازہ بند ہونا ضروری ہے۔ صاحب قرآن نے خود آیت کی تفسیر کی ہے۔ مسلم میں ابوہریرہ اور ابو داؤد و ترمذی میں ثوبان سے مرفوعاً روایت ہے کہ قیامت سے قبل دجالون، کذابوں نبوت کا دعویٰ کریں گے۔ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ۔ حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کسی کو نبوت نہیں مل سکتی۔ یہی الفاظ حذیفہؓ سے طبرانی واحمد نے مرفوعاً نقل کئے ہیں۔ بخاری و مسلم میں بروایۃ ابوہریرۃ نبوت کو ایک ایسے گھر سے تشبیہ دی ہے جس کی تعمیر میں ہر نبی کی نبوت بطور ایک خشت کے لگ گئی۔ اور تکمیل عمارت میں صرف ایک خشت کی جگہ خالی تھی۔ حضورؐ فرماتے ہیں: فَاَنَا هٰذِهِ اللَّبِنَةُ وَاَنَا خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ۔ ابوہریرۃ سے مرفوعاً حضور کی چھ خصوصیات ذکر ہیں۔ ان میں چھٹی خصوصیت وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّوْنَ۔ یعنی مجھ پر پیغمبری کا سلسلہ ختم ہوا (رواہ مسلم فی الفضائل)

ابن ماجہ نے باب فتنۃ الدجال میں ابوامامۃ سے مرفوعاً روایت نقل کی ہے۔ وَاَنَا آخِرُ الْاَنْبِيَاءِ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ۔ یعنی میں آخری نبی ہوں اور تم آخری امت ہو۔ اسی طرح صحیحین میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علیؓ کو یہ فرمانا کہ اَنْتَ مِنِّيْ بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسٰى اِلَّا اَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ۔ یعنی تیرا تعلق مجھ سے وہ ہے جو حضرت ہارون کو موسیٰ علیہ السلام سے تھا۔ بجز اس کے کہ ہارون نبی تھے اور میرے بعد نبی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح صحیحین کی یہ روایت کہ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ کہ نبوت میں سے کوئی چیز باقی نہیں رہی بجز سچے خوابوں کے۔

آیت ختم کے متعلق خود مرزا کا ازالہ اوہام ص ۶۱۴، ص ۲۵۲ میں بیان ہے۔ لکھتے ہیں: مگر وہ رسول ختم کرنے والا ہے نبیوں کا۔ یہ آیت کہ بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کوئی رسول دنیا میں نہیں آئیگا۔ حمامۃ البشریٰ ص ۲۰ میں لکھتے ہیں: اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ الرَّبَّ الرَّحِيْمَ الْمُتَفَضِّلَ سَمّٰى نَبِيَّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْاَنْبِيَاءِ بِغَيْرِ اسْتِثْنَاءٍ وَفَسَّرَ نَبِيُّنَا فِيْ قَوْلِهٖ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ بِبَيَانٍ وَاضِحٍ لِلطَّالِبِيْنَ۔ ایام الصلح ص ۱۴۶ میں لکھتے ہیں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاتم النبیین کی تفسیر لانبی بعدی

کے ساتھ فرمائی کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور طالبین حق کے لئے یہ بات واضح ہے۔ حدیث لانبی بعدی میں لانفی عام ہے۔ کتاب البریت صـ۱۸۴ پر لکھتے ہیں۔ آنحضرت نے بار بار فرمایا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اور حدیث لانبی بعدی ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا۔ اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے۔ اپنی آیت کریمہ ولٰکن رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖن۔ سے بھی اس کی تصدیق کرتا ہے کہ فی الحقیقت ہمارے نبی کریم پہ نبوت ختم ہو چکی ہے۔ تریاق القلوب صـ۳۷۹ میں لکھتے ہیں ؎

رہ ہست او خیر الرسل خیر الانام　　ہر نبوت را بروشد اختتام

ان تصریحات کے بعد اس امر میں کیا کوئی شبہ باقی رہ سکتا ہے کہ آیت مذکورہ ختم نبوت میں قطعی الثبوت ہونے کے علاوہ قطعی الدلالت بھی ہے۔

لفظ خاتم النبیین اور لغت عرب | ۱۔ روح المعانی میں ہے کہ خاتم ما یختم بہ کو کہا جاتا ہے جیسے طابع مَا یُطْبَعُ بِہٖ کو کہا جاتا ہے۔ فَمَنْ خَاتَمُ النَّبِیّٖنَ الَّذِیْ خُتِمَ النَّبِیُّوْنَ بِہٖ ومالہ آخَرُ النَّبِیّٖنَ۔

۲۔ مفردات راغب میں ہے۔ وَخَاتَمُ النَّبِیّٖنَ لِاَنَّہٗ ختم النبوۃ

۳۔ وَفِی الْمُحْکَمِ لِابْنِ سِیْدَۃَ وَخَاتَمُ کُلِّ شَیْءٍ وَخَاتِمَتُہٗ عَاقِبَتُہٗ، وَاٰخِرُہٗ

۴۔ وَفِی التَّھْذِیْبِ لِلْاَزْھَرِیِّ وَخَاتَمُ النَّبِیّٖنَ اَیْ اٰخِرُھُمْ۔

۵۔ وَفِیْ لِسَانِ الْعَرَبِ وَخَاتِمُھُمْ وَخَاتَمُھُمْ اٰخِرُھُمْ۔

۶۔ وَفِیْ تَاجِ الْعُرُوْسِ اَلْخَاتَمُ بِالْفَتْحِ وَالْکَسْرِ مِنْ اَسْمَائِہٖ عَلَیْہِ السَّلَامُ وَھُوَ الَّذِیْ خُتِمَ النُّبُوَّۃُ بِمَجِیْئِہٖ۔

۷۔ وَفِیْ مَجْمَعِ الْبِحَارِ وَخَاتَمُ بِالْفَتْحِ بِمَعْنَی الطَّابِعِ اَیْ شَیْءٍ یَدُلُّ عَلٰی اِنَّہٗ لَانَبِیَّ بَعْدِیْ۔

۸۔ وَفِی الْقَامُوْسِ اَلْخَاتَمُ اٰخِرُ الْقَوْمِ کَالْخَاتِمِ وَخَاتَمُ النَّبِیّٖنَ اَیْ اٰخِرُھُمْ۔

۹۔ وَفِی الصِّحَاحِ وَخَاتِمُ بِکَسْرِ التَّاءِ وَفَتْحِھَا کُلُّہٗ بِمَعْنٰی وَالجمع الْخَوَاتِمُ وَخَاتِمَۃُ الشَّیْءِ اٰخِرُہٗ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ خَاتَمُ الْاَنْبِیَاءِ۔

۱۰۔ وَفِیْ کُلِّیَّاتِ اَبِی الْبَقَاءِ وَتَسْمِیَۃُ نَبِیِّنَا خَاتَمَ الْاَنْبِیَاءِ لِاَنَّ خَاتَمَ الْقَوْمِ اٰخِرُ الْقَوْمِ ثُمَّ قَالَ وَنَفْیُ الْاَعَمِّ یَسْتَلْزِمُ نَفْیَ الْاَخَصِّ۔

لفظ خاتم النبیّین و مفسّرین کرام | قرآن حکیم کی جس قدر تفاسیر عہد صحابہ سے لے کر عہد مرزا تک لکھی گئی ہیں۔ یا بعد عہد مرزا یا قرآن کے جس قدر تراجم کئے گئے ہیں سب نے خاتم النبیّین کی تفسیر و تشریح یہ کی ہے کہ حضور کے بعد کسی کو نبوّت نہیں مل سکتی لیکن جس گورداسپوری کو نبی بننے کی سوجھی صرف اس نے وہ بھی اوّل میں نہیں بلکہ آخر میں اپنا عقیدہ دربارۂ ختم نبوّت اور اپنی تشریح ختم نبوّت کو بدل ڈالا تاکہ نبی بننے کی گنجائش نکل آئے جس سے اس کو خلاف امید کامیابی ہوئی، اس کا اپنا بیان ہے کہ مجھے یہ گمان نہ تھا کہ مسلمان اس چیز کو قبول کریں گے۔ کہ نبوّت جاری ہے، لیکن انگریزی تعلیم اور انگریزی حکومت کی حمایت اور زوال فہم و عظمت دین نے ناشدنی کو شدنی بنایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہاں تک کہ اس مصنوعی نبوّت نے ایک کامیاب اور نفع بخش فیکٹری کی شکل اختیار کی اور مرتد سازی کا نام تبلیغ اسلام رکھ کر اس فیکٹری کی آمدنی میں خوب اضافہ کیا گیا۔

دوسری طرف اس نبوّت کے ماننے والوں پر عہدوں اور تنخواہوں کی بارش ہونے لگی جس نے انہیں یہ احساس دلایا کہ یہ سب کچھ اس خود ساختہ نبوّت پر ایمان لانے کی برکت ہے یا بالفاظ دیگر مرزا کا معجزہ ہے جس سے مسلمانوں کی اکثریت محروم ہے۔ اگر حالات اور ہماری غفلت کی رفتار یہی رہی تو عجب نہیں کہ مسلمانوں کو ایک اور اسرائیل سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن اس وقت کوئی تدبیر کارگر نہ ہو گی۔

کشورے محکم اساسے بایدت — دیدۂ مردم شناسے بایدت
مرشد رومی حکیم پاک زاد — سرِ مرگ و زندگی بر ما کشاد
ہر ہلاکِ اُمّت پیشیں کہ بود — زانکہ بر جندل گماں بردند عود (اقبالؒ)

۱۔ امام المفسرین ابن جریر الطبری اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں:

وَلٰکِنَّہٗ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ	یعنی آپ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیّین
الَّذِیْ خَتَمَ النُّبُوَّۃَ فَطَبَعَ عَلَیْھَا	جس نے نبوّت کو ختم کیا اور اس پر مہر لگا دی
فَلَا تفتح لِاَحَدٍ بَعْدَہٗ اِلٰی قِیَامِ	پس وہ آپ کے بعد کسی کے لئے نہ کھولی جائیگی
السَّاعَۃِ وَبِنَحْوِ الَّذِیْ قُلْنَا قَالَ	قیامت کے قائم ہونے تک، اور ایسا ہی
اَھْلُ التَّاوِیْلِ۔ (ج ۲۲ ص ۱۱)	آئمہ تفسیر، صحابہ و تابعین نے فرمایا۔

۲۔ حضرت علی بن حسین سے ابن جریر نقل فرماتے ہیں:

بِکَسْرِ التَّاءِ مِنْ خَاتِمَ النَّبِیّٖنَ بِمَعْنٰی — خاتم النبیّین بکسر التاء اس معنی میں کہ آپ نے

إِنَّهُ خَتَمَ النَّبِيِّينَ إِلَى قَوْلِهِ وَقَرَءَ ذَالِكَ فِيمَا يَذْكُرُ الْحَسَنُ وَالْعَاصِمُ وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ بِفَتْحِ التَّاءِ بِمَعْنَى إِنَّهُ آخِرُ النَّبِيِّينَ۔ (ج ۲۲ صـ۱۱)

تمام انبیاء کو ختم کر دیا اور جیسا کہ منقول ہے قراء میں سے حسن اور عاصم نے اس کو بفتح التاء پڑھا ہے اس معنی میں کہ آپ آخر النبی ہیں۔

۳۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے:

فَهٰذِهِ الْآيَةِ نَصٌّ فِي إِنَّهُ لَانَبِيَّ بَعْدَهُ وَإِذَا كَانَ لَانَبِيَّ بَعْدَهُ فَلَارَسُولَ بِالطَّرِيقِ الْأَوْلٰى لِأَنَّ مَقَامَ الرِّسَالَةِ أَخَصُّ مِنْ مَقَامِ النُّبُوَّةِ فَإِنَّ كُلَّ رَسُولٍ نَبِيٌّ وَلَا يَنْعَكِسُ وَبِذَالِكَ وَرَدَتِ الْأَحَادِيثُ الْمُتَوَاتِرَةُ مِنْ حَدِيثِ جَمَاعَةٍ مِنَ الصَّحَابَةِ۔ (ابن کثیر ج ۸ صـ۸۹)

یہ آیت نص صریح ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا جب کوئی نبی نہ ہو تو رسول بدرجہ اولیٰ نہ ہو گا کیونکہ رسالت نبوۃ سے خاص ہے۔ ہر رسول کا نبی ہونا ضروری ہے اور ہر نبی کا رسول ہونا ضروری نہیں۔ اس پر رسول اللہ کی احادیث متواترہ وارد ہوئی جو صحابہ کی بڑی جماعت نے آپ سے نقل کی ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

لِيَعْلَمُوا أَنَّ مَنْ كُلَّ مَنِ ادَّعٰى هٰذَا الْمَقَامَ بَعْدَهُ فَهُوَ كَذَّابٌ أَفَّاكٌ دَجَّالٌ۔ (ج: ۸ صـ۹۱)

تاکہ امت جان لے تاکہ آپ کے بعد ہر وہ شخص جو اس مقام کا (نبوت) کا دعویٰ کرے وہ جھوٹا افتراء پرداز اور دجال ہے۔

۴۔ تفسیر کشاف میں ہے:

خَاتَمُ بِفَتْحِ التَّاءِ بِمَعْنَى الطَّابِعِ وَبِكَسْرِهَا بِمَعْنَى الطَّابِعِ وَفَاعِلُ الْخَتْمِ وَتَقْوِيَةِ قِرَاءَةُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُودٍ وَّلٰكِنْ نَبِيًّا خَتَمَ النَّبِيِّينَ فَإِنْ قُلْتَ كَيْفَ يَكُونُ آخِرَ الْأَنْبِيَاءِ وَعِيسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ يَنْزِلُ آخِرَ الزَّمَانِ قُلْتُ

خاتم بفتح التاء بمعنی آلہ مُہر و بکسر التاء بمعنی مہر کرنے والا۔ اور اس معنی کی تقویت کرتی ہے۔ ابن مسعود کی قراءت ولکن نبیا ختم النبیین۔ اگر آپ یہ کہیں کہ آپ خاتم الانبیاء کس طرح ہو سکتے ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام آخر زمان میں آسمان سے اتریں گے۔ جواب یہ ہے کہ آپ کے بعد کوئی شخص

مَعْنٰی کَوْنِهٖ اٰخِرَ الْاَنْبِیَاءِ اَنَّهٗ لَا یُنَبَّأُ اَحَدٌ بَعْدَهٗ وَعِیْسٰی مِمَّنْ نُبِّئَ قَبْلَهٗ۔

نبی نہ بنایا جائے گا۔ اور عیسیٰ ان لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنا کر بھیجے گئے۔

۵۔ تفسیر روح المعانی میں ہے :

وَالْمُرَادُ بِالنَّبِیِّ مَا هُوَ اَعَمُّ مِنَ الرَّسُوْلِ فَیَلْزَمُ مِنْ کَوْنِهٖ خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ کَوْنُهٗ خَاتَمَ الْمُرْسَلِیْنَ وَالْمُرَادُ بِکَوْنِهٖ خَاتَمَهُمُ انْقِطَاعُ حُدُوْثِ وَصْفِ النُّبُوَّةِ فِیْ اَحَدٍ مِنَ الثَّقَلَیْنِ بَعْدَ تَحَلِّیْهِ عَلَیْهِ السَّلَامُ بِهَا فِیْ هٰذِهِ النَّشْأَةِ وَلَا یَقْدَحُ فِیْ ذٰلِكَ مَا اُجْمِعَتْ عَلَیْهِ الْاُمَّةُ وَاشْتَهَرَتْ فِیْهِ الْاَخْبَارُ وَلَعَلَّهَا بَلَغَتْ مَبْلَغَ التَّوَاتُرِ الْمَعْنَوِیِّ وَنَطَقَ بِهِ الْکِتَابُ عَلٰی قَوْلٍ وَّوَجَبَ الْاِیْمَانُ وَاُکْفِرَ مُنْکِرُهٗ کَالْفَلَاسِفَةِ مِنْ نُزُوْلِ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ اٰخِرَ الزَّمَانِ لِاَنَّهٗ کَانَ نَبِیًّا قَبْلَ تَحَلِّی نَبِیِّنَا بِالنُّبُوَّةِ فِیْ هٰذِهِ النَّشْأَةِ۔

آنحضرت کے خاتم النبیین ہونے سے مراد یہ ہے کہ آپ کے اس عالم میں وصفِ نبوت سے متصف ہونے کے بعد نبوت کا پیدا ہونا منقطع ہو گیا اور ختمِ نبوت اس عقیدہ سے معارض نہیں جس پر امت نے اجماع کیا اور جس میں احادیث شہرت کو پہنچی اور شاید درجۂ تواترِ معنوی کو پہنچ جائیں اور جس پر قرآن نے تصریح کی ہے اور جس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے منکر فلاسفہ کو کافر سمجھا گیا یعنی نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کیونکہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصفِ نبوت سے متصف ہونے سے پہلے وصفِ نبوت سے متصف ہو چکے تھے۔

۶۔ تفسیر مدارک میں ہے :

خَاتَمَ النَّبِیِّیْنَ بِفَتْحِ التَّاءِ عَاصِمٌ بِمَعْنَی الطَّابِعِ اَیْ اٰخِرُهُمْ اَیْ لَا یُنَبَّأُ اَحَدٌ بَعْدَهٗ وَعِیْسٰی

عاصم کی قرات میں بفتح التاء بمعنی الطابع جس سے مراد آخر ہے اور عیسیٰ علیہ السلام آپ سے پہلے نبی بنائے گئے اور عاصم کے

بِمَنْ شَيْءٍ قَبْلَهٗ وَغَيْرُهٗ بِكَسْرِ التَّاءِ بِمَعْنَى الطَّابِعِ وَفَاعِلُ الْخَتْمِ وَتُقَوِّيْهِ قِرَاءَةُ ابْنِ مَسْعُوْدٍ

بغیر سب قراء کے نزدیک بکسر التاء یعنی مہر کرنیوالا اور ختم کرنیوالا جس کی ابن مسعود کی قرارت تائید کرتی ہے۔

۷۔ زرقانی شرح مواہب میں ہے: خَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ اَيْ آخِرُهُمْ۔ خاتم النبیین کے معنی آخری نبی کے ہیں (ج: ۵ ص۲۶۷)۔ یہی معنی تفسیر بحر المحیط ج، ص۲۳۶ اور ابو السعود برحاشیہ تفسیر کبیر ج ص۶۸۸ میں لکھا ہے۔

۸۔ شفاء قاضی عیاض تفسیر آیت خاتم النبیین میں لکھتے ہیں۔ (طبع بریلی ص۳۶۲)

مَنِ ادَّعٰى مِنْهُمْ اَنَّهٗ يُوْحٰى اِلَيْهِ وَاِنْ لَّمْ يَدَّعِ النُّبُوَّةَ اِلٰى اَنْ قَالَ فَهٰؤُلَاءِ كُلُّهُمْ كُفَّارٌ مُكَذِّبُوْنَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِاَنَّهٗ اَخْبَرَ اَنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَلَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ وَاَخْبَرَ عَنِ اللّٰهِ اَنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَاَنَّهٗ اُرْسِلَ اِلٰى كَافَّةِ النَّاسِ وَاَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ عَلٰى حَمْلِ هٰذَا الْكَلَامِ عَلٰى ظَاهِرِهٖ وَاَنَّ مَفْهُوْمَهُ الْمُرَادُ بِهٖ دُوْنَ تَاْوِيْلٍ وَّلَا تَخْصِيْصٍ فَلَا شَكَّ فِيْ كُفْرِ هٰؤُلَاءِ الطَّوَائِفِ قَطْعًا اِجْمَاعًا وَّسَمْعًا۔

جو وحی کا دعویٰ کرے اگرچہ نبوت کا دعویٰ نہ کرے تو یہ سب گروہ کفار ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے والے، جس نے خبر دی کہ وہ آخری نبی ہیں اور اُن کے بعد کوئی نبی نہیں ہوسکتا اور وہ سب لوگوں کیطرف بھیجے گئے ہیں، اور آپ کے ظاہری معنی پر بلا تاویل و تخصیص محمول ہونے پر اُمت متفق ہے تو اس کے خلاف معنی اختیار کرنے کے کفر میں کوئی شک نہیں۔

۹۔ غزالی لکھتے ہیں۔

اِنَّهٗ لَيْسَ فِيْهِ تَاْوِيْلٌ وَّلَا تَخْصِيْصٌ وَّمَنْ اَوَّلَهٗ بِتَخْصِيْصٍ فَكَلَامُهٗ مِنْ اَنْوَاعِ الْهَذَيَانِ

اس آیت میں تاویل و تخصیص نہیں۔ جو ایسا کرے وہ بکواس کرتا ہے، جو اس کو حکم کفر سے

باقی ص۶۲ پر

جناب اختر راحمی - ایم - اے

ابنِ حاجبؒ ــــــ صاحبِ کافیہ ــــــ

ساتویں صدی ہجری میں جن اصحاب علم وفضل نے عربی علم وادب کی دنیا میں نام پیدا کیا۔ ان میں سے ایک "ابن حاجب" تھے۔ ابن حاجب کا نام عثمان، کنیت ابو عمرو اور لقب جمال الدین تھا۔ لیکن زمانے نے انہیں "ابن حاجب" کی کنیت سے یاد رکھا۔ تذکرہ نویس ان کا ذکر "جمال الدین ابو عمرو عثمان بن عمر بن ابی بکر بن یونس" کے ذیل میں کرتے ہیں:

ابن حاجب قبیلہ کُرد سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کے والد "عمر" عزالدین کے حلقہ احباب میں شامل تھے اور "حاجب" کے منصب پر فائز۔ اسی نسبت سے "ابن حاجب" نے شہرت پائی۔ حجابت مسلمان حکومتوں میں ایک اہم منصب تھا۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں ان کے گھروں پر کوئی نگران نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کے دروازے ہر خاص وعام کے لئے کھلے رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ خلیفۂ دوم تو اس معاملے میں بڑی سختی برتتے تھے۔ والیٔ مصر نے اپنے مکان کے سامنے ڈیوڑھی بنائی تو حضرت عمرؓ نے اطلاع ملتے ہی اُسے مسمار کرنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔

خلافت راشدہ کے بعد اموی دور آیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے حاجب مقرر کیا۔ ابن خلدونؒ نے "حجابت" کے سلسلے میں لکھا ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ سے پہلے تین خلفاء نہایت بے رحمی سے شہید کر دئے گئے تھے اور پھر جس حالت میں ان کی اپنی خلافت طے پائی تھی اس کے پیش نظر حاجب مقرر کئے گئے بعد ازاں مسلمان ریاستوں میں یہ ایک اہم عہدۂ حکومت بن گیا۔

ولادت: ابن حاجب بالائی مصر کے ایک گاؤں فنا میں ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۵ء کے آخری دنوں میں پیدا ہوا۔

تعلیم وتربیت: قرآن پاک اور اس سے متعلق علوم کی تحصیل کی۔ قاہرہ میں مالکی فقہ کا مطالعہ کیا۔ اور یہیں عربی قواعد نحو سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اُن کے استادوں میں امام شاطبی (م) اور

ماہر قانون ابو منصور ابیاری بھی شامل ہیں۔

تدریس | ابن حاجب نے درس و تدریس کا پیشہ اپنایا۔ چنانچہ قاہرہ سے دمشق چلا گیا۔ جہاں جامع اموی کے زاویۂ مالکی میں تعلیم دینے پر مامور ہوگیا۔ یہاں ایک عرصہ تک فقۂ مالکی پر درس دیتا رہا۔

وفات | دمشق سے قاہرہ واپس چلا گیا اور قاہرہ سے سکندریہ کی راہ لی۔ آخر سکندریہ ہی میں ۲۶ر شوال ۶۴۶ھ مطابق ۱۱ر فروری ۱۲۴۹ء کو فوت ہوگیا۔

تصانیف | ابن حاجب کی تصانیف پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے علم عروض اور فقہ مالکی پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ تاہم اسکی شہرت نحوی کی حیثیت سے عام ہے۔ اس میدان میں وہ اپنے پیش رؤوں سے کئی نکات میں اختلاف رکھتا ہے۔

ماہر قانون و فقہ کی حیثیت سے ابن حاجب نے مغربی اور مصری مالکی مکتب فکر میں تطبیق کی کوشش کی ہے۔

ابن حاجب سے مندرجہ ذیل کتابیں یادگار ہیں۔ اس کی زبان سلیس اور روان ہے اور یہی وجہ ہے کہ کافیہ اور شافیہ آج بھی مقبول اور متداول ہیں۔

۱۔ الکافیہ (نحو) ایک رائے کے مطابق جار اللہ زمخشری کی تالیف المفصل کی تلخیص ہے۔ ۱۵۹۱ء میں روم میں طبع ہوا۔

۲۔ الشافیہ : عربی زبان کی صرف پر معروف رسالہ ہے اور مدارس عربیہ میں متداول ہے۔ یہ رسالہ ۱۸۰۵ء میں کلکتہ میں طبع ہوا۔

۳۔ المقصد الجلیل فی علم الخلیل | عربی عروض کا بانی خلیل بن احمد تصور کیا جاتا ہے۔ اس لئے ابن حاجب نے عروض کو "علم الخلیل" قرار دیا ہے۔ بحر بسیط میں یہ ایک نظم ہے۔ اور عروض میں بحر بسیط کا وزن یہ ہے:

مستفعلن، فاعلن، مستفعلن، فاعلن۔

اس کی پانچ شرحیں شائع ہوئی ہیں۔

۴۔ منتہی السوال والامال۔ (فقہ مالکی)

۵۔ مختصر المنتہیٰ (مختصر الاصول) (")

فقہ مالکی میں یہ دونوں کتابیں بہت اہم تصور کی جاتی ہیں۔

★

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

قانونِ اسلامی کی تدوینِ جدید کی ضرورت

اس میں شبہ نہیں کہ عالمِ اسلام کے مختلف گوشوں میں ایسی ممتاز دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے بعض وسیع حلقوں کو اپنی طاقتور اور دلآویز شخصیتوں سے متاثر کیا اور ایک بڑے طبقہ کو ذہنی ارتداد سے بچالیا اور بعض گوشوں میں فقہ و مسائلِ اسلامیہ پر کسی حد تک انفرادی کام بھی ہوا اور فقہ و قانونِ اسلامی کو نئے لباس میں پیش کیا گیا[۱] لیکن عالمِ اسلام میں ایک ایسی طاقتور عالمگیر علمی تحریک کی کمی برابر محسوس کی جارہی ہے جو جدید طبقہ کا اسلام کے علمی ذخیرہ سے رشتہ و رابطہ قائم کر سکے۔ اسلامی علوم میں نئی روح پھونک سکے اور اس حقیقت کو ثابت کر سکے کہ اسلامی قانون اور فقہ نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور ازکار رفتہ نہیں ہو سکتے، جس میں زندگی کے تغیّرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی و انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں، یہی عصرِ حاضر کا وہ ضروری کام ہے جو اسلامی ملکوں اور موجودہ اسلامی معاشرہ کو ذہنی و معاشرتی ارتداد سے بچا سکتا ہے اور مغرب زدگی اور تجدّد کے اس تیز دھارے کو روک سکتا ہے جو عالمِ اسلام میں اس وقت اپنی پوری طغیانی پر ہے، علامہ اقبالؔ نے اس کام کی ضرورت و اہمیّت اور اس کے دور رس نتائج کے متعلق بجا طور پر لکھا ہے:

"میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص زمانۂ حال کے جورس پروڈنس (JURISPRUDENCE)

---

[۱] مثال کے طور پر استاذ مصطفیٰ زرقار کی قابلِ قدر کتاب "المدخل الفقہی العام" ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی کی کتاب "الاحوال الشخصیۃ۔" (۱-۲-۳) مصر میں شیخ محمد ابوزہرہ کے بعض مضامین مسائلِ جدیدہ پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔

(اصولِ قانون) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا، قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، یا قوانینِ اسلامیہ پر غور کر رہے ہیں۔ غرض یہ وقت عملی کام کا ہے، کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے، اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (اقبال نامہ حصہ اول صنہ ۵۰، ۵۱)

فقہ اسلامی کی جدید تدوین و توسیع کا کام کسی نئے قانون کی بنیاد رکھنے کے مرادف نہیں، جس کیلئے نئے اصول وضع کرنے اور ایک چیز کو عدم سے وجود میں لانے کی ضرورت ہو، اسلامی فقہ، قانون کا وہ عظیم سرمایہ اور انسانی ذہانت و محنت کا وہ عجیب و غریب نمونہ ہے جس کی نظیر دنیا کے قانونی ذخیروں میں ملنی مشکل ہے، یہ زندگی کے بہت بڑے حصہ اور عصرِ قدیم کے اکثر حالات پر حاوی ہے، صرف اسکی ضرورت ہے کہ ان حکیمانہ اصول و کلیات سے (جو سراسر قرآن و حدیث پر مبنی ہیں) نئے جزئیات کا استنباط کیا جائے اور ان سے موجودہ زندگی کی ضروریات اور تبدیلیوں میں رہنمائی حاصل کی جائے، اس فقہی ذخیرہ کی وسعت اور اس کی قانونی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے مشہور شامی فاضل و ماہرِ قانون مصطفٰے احمد الزرقاء کی کتاب "المدخل الفقھی العام الی الحقوق المدنیۃ" کے مقدمہ سے ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں انہوں نے پیرس یونیورسٹی کے ہفتہ "قانونِ اسلامی کے سیمنار میں مغربی ماہرینِ قانون کا فقہ اسلامی سے متعلق تاثر و نظریہ پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں؛

"مماثل قوانین کی عالمی اکیڈمی کی مشرقی قانون کی شاخ نے پیرس یونیورسٹی کے لاکالج میں ۲ر جولائی ۱۹۵۱ء میں فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا اور ایک کانفرنس منعقد کی، یہ کانفرنس موسیو MILLIOT پروفیسر فقہ اسلامی پیرس یونیورسٹی کی صدارت میں ہوئی اس میں عرب غیر عرب ملکوں کے لاکالجوں کے اساتذہ ازہر کے نمائندے، عرب اور فرانسیسی وکلاء نیز مستشرقین بڑی تعداد میں مدعو کئے گئے، مصر سے چار نمائندے منتخب ہو کر گئے، دو جامعہ فواد سے ایک، جامعہ ابراہیم کے لاکالج کے پرنسپل اور ازہر کی ھیئۃ کبار العلماء[1] کا ایک نمائندہ دمشق یونیورسٹی کے لاکالج کی طرف سے میں نے اور ڈاکٹر معروف الدوالیبی نے نمائندگی کی، نمائندوں نے دیوانی فوجداری اور مالی قوانین کے پانچ عنوانات پر بحث کی جو کیڈمی کیطرف سے پہلے

[1] علماء ازہر کی وہ بڑی کونسل جو اہم دینی و علمی مسائل میں فیصلہ کرتی ہے۔

متعین کر دئے گئے تھے، وہ حسب ذیل تھے :

۱۔ ملکیت کا اثبات ۔ ۲۔ عام مفاد کے لئے استلاک (عوام کی املاک پر قبضہ) ۳۔ جرم کی ذمہ داری ۔ ۴۔ اجتہادی مذاہب فکر کا ایک دوسرے پر اثر ۔ ۵۔ سود کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر ۔

یہ سب لیکچر اور مباحث فرنچ میں ہوئے تھے اور ہر موضوع کیلئے ایک دن مقرر تھا، ہر لیکچر کے بعد مقرر اور کانفرنس کے نمائندوں کے درمیان مباحثہ ہوتا تھا جو موضوع اور ضرورت کے اعتبار سے کبھی طویل ہوتا تھا کبھی مختصر، اس کا خلاصہ قلمبند کر لیا جاتا تھا ۔

اسی قسم کے مباحثہ کے درمیان ایک ممبر جو پیرس کے بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے کھڑے ہوئے اور انہوں نے کہا : "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عمومی خیال میں کہ اسلامی فقہ جامد ہے اور اس میں جدید معاشرہ کی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت نہیں ہے ۔ اور اس کانفرنس کی تقریروں اور مباحثوں سے اصول و شواہد کی بنیاد پر اس کے بالکل برخلاف جو بات ثابت ہو رہی ہے ان دونوں میں کیسے مطابقت پیدا کروں ۔؟"

کانفرنس کے اختتام پر تمام نمائندوں نے بالاجماع ایک تجویز پاس کی جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے ۔

اس کانفرنس کے شرکاء ان مباحث کے پیش نظر جو فقہ اسلامی کے سلسلہ میں پیش ہوئے اور ان بحثوں کی بنا پر جس سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو گئی کہ ۔۔۔ (الف) اسلامی فقہ کی ایک خاص (قانونی و دستوری) قیمت ہے جس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ۔ (ب) اس عظیم قانونی سرمایہ میں فقہی مذاہب کا یہ اختلاف، معلومات، مدلولات اور قانونی اصولوں کا بڑا خزانہ ہے جو اعتراف و تحسین کا پورا مستحق ہے اور اس کے ذریعہ فقہ اسلامی اس قابل ہے کہ جدید زندگی کی ضروریات اور حاجت کی تکمیل کر سکے ۔۔۔ اپنی اسی خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ہفتہ ہر سال منایا جایا کرے، اور کانفرنس کے سکریٹریٹ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ ان موضوعات کی ایک فہرست تیار رکھے جن کو آئندہ جلسہ میں بحث و مذاکرہ کی بنیاد بنانے کی ضرورت ہے اور جنکی اہمیت کا گذشتہ مباحثات سے اظہار ہوتا ہے ۔

کانفرنس کے نمائندے اسکی بھی امید رکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی ایک ڈائرکٹری تیار کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنادی جائے گی جس کے ذریعہ قانون کی کتابوں سے استفادہ اور مراجعت آسان ہو جائے گی، اور وہ ایک ایسا فقہی انسائیکلو پیڈیا بن سکے گی جس میں اسلامی قانون کی تمام معلومات جدید طرز پر مرتب کی گئی ہوں گی ——

(المدخل الفقہی العام، س، ج، د، ۷ تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء)

امامِ ربّانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے علوم و معارف

بروایت حکیم الامت مولانا تھانویؒ

مختصر احوال و سوانح

پیدائش | حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سہارن پور ضلع کے قصبہ گنگوہ محلہ سرائے متصل خانقاہ حضرت شاہ عبدالقدوس گنگوہیؒ ۶ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ بروز دوشنبہ بوقت چاشت پیدا ہوئے۔ والد ماجد کا نام حضرت مولانا ہدایت اللہ صاحبؒ تھا جو حضرت شیخ غلام علی صاحب کے خلیفہ مجاز تھے۔

تعلیم و تربیت | ابتدائی کتب گنگوہ میں مولانا عنایت احمدؒ سے پڑھیں۔ فارسی کی بقیہ کتب اپنے ماموں مولانا محمد تقی صاحب اور مولانا غوث محمد صاحب سے پڑھیں۔ عربی کا شوق ہونے پر ابتدائی صرف و نحو کی کتب مولانا محمد بخش صاحب رامپوری سے پڑھیں اور انہی کی ترغیب سے ۱۷ سال کی عمر میں ہدایت النحو پڑھ کر دہلی تشریف لے گئے۔ چند دنوں قاضی احمد الدین صاحب پنجابی سے پڑھا۔ اور اسی سال ۱۲۶۱ھ میں حضرت مولانا مملوک علی صاحبؒ کے پاس حاضر ہوئے۔ جہاں ایک سال قبل حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ تشریف لا چکے تھے۔ اس طرح دونوں شمس و قمر کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ ہوئی۔ علم حدیث خاندان ولی اللّٰہی کے آخری چشم و چراغ راس الاتقیاء حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلویؒ و مہاجر مدنی سے حاصل کیا۔ معقولات کی چند کتابیں مفتی صدر الدین صاحب آزردہ سے پڑھیں ———

نکاح | حضرت گنگوہیؒ کا نکاح ان کے پاکباز اور پاک باطن ماموں حضرت مولانا محمد تقی صاحبؒ

مجاز طریقت سلسلہ قادریہ کی بزرگ اور صالح صاحبزادی حضرت خدیجہؒ سے ہوا۔ جنکی عمر ۱۵ برس اور حضرت گنگوہیؒ کی عمر ۲۱ برس تھی۔

بیعت وسلوک | حضرت گنگوہیؒ دہلی سے دستار فضیلت حاصل کرنے کے بعد وطن عزیز تشریف لائے اور سید مومن علی صاحب کو علم دین پڑھانا شروع کیا۔ اسی دوران حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانویؒ کی تحریر دربارہ مسئلہ روضہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نظر سے گزری کہ جو جگہ ایک قبر کیلئے افتادہ ہے۔ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام مدفون ہوں گے۔ یہ امر قطعی ہے اور اس کا منکر ایسا ہے، ویسا ہے۔ حضرت گنگوہیؒ نے حضرت شیخ صاحبؒ کی اس تحریر پر تحریر فرمایا کہ سارا ثبوت باحادیث اخبار احاد ہے۔ اس لئے اس سے علم ظنی حاصل ہوگا۔ قطعیت کا ثبوت دشوار ہے۔ یہ جواب حضرت شیخ صاحبؒ کی نظر سے گذرا تو جوش وغضب میں بھر گئے۔ پھر کیا تھا طرفین میں سوال وجواب شروع ہو گئے۔ بالآخر حضرت گنگوہیؒ ایک بارات کیساتھ تھانہ بھون تشریف لے گئے اور حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا منشاء عرض کیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ کہہ کر کہ "وہ ہمارے بڑے ہیں" مناظرے سے منع فرمادیا۔ حضرت حاجی صاحب نے حضرت گنگوہی کے اصرار اور حضرت حافظ محمد ضامن صاحب شہیدؒ کی سفارش پر بیعت فرمالیا۔

الزام بغاوت وگرفتاری | ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے ہولناک حادثہ کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ ہندوستان سے ہجرت فرماکر مکہ معظمہ تشریف لے گئے۔ اور حضرت حجۃ الاسلام مولانا نانوتویؒ اور امام ربّانی حضرت گنگوہیؒ روپوش ہو گئے۔ تگری میں حضرت گنگوہیؒ نے حضرت حاجی صاحبؒ سے آخری ملاقات کی۔ آپکی عدم موجودگی میں گنگوہ میں آپ کے ماموں زاد بھائی مولانا ابوالنصرؒ کو گرفتار کرکے سخت زدوکوب کیاگیا اور پھر رہا کر دیاگیا۔ تگری سے گنگوہ واپسی کے بعد حضرتؒ کو حالات کا علم ہوا تو عزیز واقارب کے مشورے سے اپنے داد ھیال رامپور تشریف لے گئے لیکن مخبر کی خبر رسانی سے حکیم ضیاء الدین صاحبؒ کے مکان سے گرفتار ہوئے۔ سہارن پور کی جیل کی کال کوٹھری میں آپکو رکھاگیا مقدمہ چلتا رہا۔ حالات کی تفتیش جاری رہی۔ حاکم نے آپ سے سوال کیا کہ کیا آپ کے پاس اسلحہ ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں اور جیب سے تسبیح نکال کر دکھائی۔

سہارنپور جیل سے آپ کو مظفر نگر جیل میں منتقل کر دیاگیا۔ بالآخر جب گورنمنٹ کو کوئی ثبوت نہ ملا تو رہا کر دئے گئے۔ زمانہ جیل میں اکثر قیدی آپ کے معتقد ہو گئے اور بہت سے تائب ہوکر بیعت ہو گئے۔ ہمیشہ جیل خانہ میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے۔ رہائی کے بعد سلوک وتصوّف

اور درس وتدریس میں مشغول ہو گئے۔ اور ظالم حکومت کا مقابلہ کرنے کیلئے دو مشہور علمی دینی چھاؤنیوں دارالعلوم دیوبند اور مظاہرالعلوم سہارن پور کی ترقی اور فلاح کے لئے مصروف ہو گئے۔ یہاں سے بڑے بڑے جرنیلوں اور سپہ سالاروں کو تیار کیا۔ جنکی کوششوں سے پاکستان بنا اور آجکل اس لادینی اور آزادی فکر کے زمانہ میں کچھ دینی فضا موجود ہے وہ ان کے روحانی فرزندوں کی مساعی ہائے جمیلہ کا موجب ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ۔ آمین۔

حج | قطب عالم حضرت گنگوہیؒ نے تین حج کئے۔ پہلا حج ۱۲۸۰ھ میں ڈپٹی عبدالحق صاحب پنشنر کے خرچہ سے کیا۔ دوسرا حج ۱۲۹۴ھ میں اکابر دیوبند حضرت مولانا محمد قاسمؒ، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ، حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ ودیگر بزرگان کی معیت میں کیا۔ تیسرا حج ۱۲۹۹ھ حاجی ظہور احمدؒ اور منشی تجمل حسین صاحبؒ کی معیت میں کیا۔

وصال مبارک | ۱۲، ۱۳ جمادی الاول ۱۳۲۳ھ کی شب میں نوافل تہجد میں آپکی خنصر وبنصر دونوں انگلیوں کے درمیان کسی زہریلے جانور نے کاٹ لیا۔ آپ کو پتہ بھی نہ چلا۔ خدام نے صبح خون کے دھبے دیکھے، خون کافی نکل گیا۔ ضعف بڑھتا رہا اور زہر کا اثر ترقی کرتا رہا۔ حتیٰ کہ ۲۷ر جمادی الاول کو شدت کا بخار چڑھا۔ آپ کے صاحبزادہ حکیم محمد مسعود صاحبؒ نے علاج کیطرف خصوصی توجہ کی لیکن افاقہ نہ ہوا۔ بالآخرہ ۹ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ بوقت اذان جمعہ واصل بحق ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اِنَّہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ۔ اور حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے مَوْلَانَا عَاشَ حَمِیْدًا مَاتَ شَہِیْدًا۔ سے تاریخ وصال نکالی۔

خلفاء مجاز | تذکرۃ الرشید میں خلفاء مجاز طریقت کی تعداد ۲۱ لکھی ہے۔ چند مشہور خلفاء کے نام یہ ہیں۔ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ، حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ اسیر مالٹا، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ حضرت مولانا صادق الیقین صاحبؒ، حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتویؒ وغیرہ۔

حضرت امام ربانیؒ کا مقام پیر ومرشد کی نظر میں | سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ اپنے رسالہ ضیاء القلوب میں تحریر فرماتے ہیں "ہر کہ ازیں فقیر محبت وارادت دارد مولوی رشید احمد سلمہ ومولوی محمد قاسم سلمہ کہ جامع جمیع کمالات علوم ظاہری وباطنی اند بجائے من راقم اوراق بلکہ بمدارج فوق از شمارند اگرچہ معاملہ برعکس شد کہ اوشان بجائے من ومن مقام اوشان

ابوحنیفۂ عصر اور حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیری محدث آپکو فقیہہ النفس فرمایا کرتے تھے۔ مرشدنا
حضرت حکیم الامتؒ آپ کو امام وقت فرمایا کرتے تھے۔

حضرت حکیم الامتؒ اور قطب عالم حضرت امام ربانیؒ

حضرت حکیم الامتؒ کی دستار بندی حضرت امام ربانیؒ کے مقدس ہاتھوں سن ۱۳۰۰ھ میں ہوئی جب حضرت گنگوہیؒ
دستار بندی کے لئے تشریف لائے تو حضرت مولانا محمود الحسن صاحبؒ نے حکیم الامتؒ کی
ذہانت اور ذکاوت کی تعریف کی۔ تعریف سن کر حضرت گنگوہیؒ نے مشکل مشکل سوالات کئے اور
حضرت حکیم الامتؒ کے جوابوں سے بہت خوش ہوئے۔ حضرت حکیم الامتؒ کی طالب علمی
کے دوران ایک مرتبہ قطب عالم حضرت گنگوہیؒ کسی ضرورت سے مدرسہ دیوبند تشریف لائے۔
حضرت حکیم الامتؒ غایت اشتیاق میں بغرض مصافحہ دوڑے تو ان اینٹوں کی وجہ سے جو اس
وقت وہاں نو درہ کی تعمیر کیلئے پڑی ہوئی تھیں۔ حضرت حکیم الامتؒ کا پاؤں بے اختیار پھسلا اور
زمین پر گرنے ہی کو تھے کہ حضرت گنگوہیؒ نے فوراً ہاتھ پکڑ کر سنبھال لیا۔ حضرت حکیم الامتؒ کو حضرت
گنگوہیؒ کی زیارت ہوتے ہی اس قدر کشش اور عقیدت ہوئی کہ بقول حضرت حکیم الامتؒ باوجود
اس وقت حقیقت وغایت بیعت بھی نہ سمجھنے کے مولاناؒ سے بیعت کی درخواست کی۔ مولاناؒ
نے اس بناء پر کہ بزمانہ طالب علمی شغل باطن مخل تحصیل علم ہوگا۔ انکار فرما دیا۔ اس واقعہ کا مفصل ذکر
حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے رسالہ یادِ یاراں میں تحریر فرمایا ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کی حضرت امام ربانی سے محبت و عقیدت

حضرت حکیم الامتؒ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے قطب عالم حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہٗ کے ساتھ غیر اختیاری اور قلبی
تعلق ہے اور حضرتؒ کی عظمت شان اور جلالت قدر بفضلہ تعالیٰ طبعی طور پر میرے دل میں ہے اور
اسی قلبی و طبعی مناسبت کی وجہ سے میں نے بیعت کیلئے بھی حضرت گنگوہیؒ سے درخواست کی تھی
مگر حضرتؒ کے قبول نہ فرمانے پر میں نے حضرت قطب عالم حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں
اس مضمون کا عریضہ تحریر کیا جس کا حاصل یہ تھا کہ آپ حضرت گنگوہیؒ سے سفارش فرما دیں مگر اس کے جواب
میں حضرت حاجی صاحبؒ نے خود بیعت فرما لیا۔ عارف باللہ حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب
امرتسریؒ فرماتے تھے کہ جب حضرت حکیم الامتؒ کے ہاں حضرت گنگوہیؒ کا ذکر شروع ہو جاتا تو دیر تک
ان کے واقعات کمالات بیان فرماتے رہتے اور عجیب شان ہوتی تھی۔ حضرت حکیم الامتؒ فرماتے تھے
کہ ان حضرات کے ذکر میں بھی گرمی ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی مجھے پسینہ آرہا ہے۔" چنانچہ حضرت

حکیم الامتؒ نے اپنی باطنی پریشانی کے دوران حضرت گنگوہیؒ سے رجوع کیا تھا، حضرت گنگوہیؒ شروع سے آخر تک اسی تجویز پر قائم رہے کہ خطرات منکرہ کیطرف التفات نہ کرو۔ حضرت حکیم الامتؒ فرمایا کرتے کہ یہی ارشاد مولانا کے امام فن ہونے کی دلیل ہے۔ اس دوران حضرت امام ربانیؒ دعا اور توجہ بھی خاص طور سے فرماتے رہے۔" حضرت حکیم الامتؒ پر جب قرض ہو گیا تو آپ نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے دعا کی درخواست کی۔ حضرت گنگوہیؒ نے حضرت حکیم الامتؒ سے پوچھا کہ کہو تو مدرسہ دیوبند میں تمہارے لئے مدرسی کی کوشش کروں۔ حضرت حکیم الامتؒ نے عرض کیا کہ میرا تو اس وقت عرض کرنے کا مقصود صرف دعا ہے۔ باقی حضرت حاجی صاحبؒ نے بعد ترک تعلق کانپور کسی اور جگہ تعلق کرنے کی ممانعت فرمادی ہے، لیکن اگر حضرتؒ کی یہی تجویز ہے تو میں اس کو بھی حضرت حاجی صاحبؒ کی تجویز سمجھوں گا کہ حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنی پچھلی تجویز منسوخ فرما کر اب یہ صورت تجویز فرمادی ہے۔ کیونکہ تجویز مؤخر ناسخ ہوتی ہے تجویز مقدم کی۔ یہ سن کر حضرت گنگوہیؒ نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں فرمایا کہ نہیں نہیں اگر حضرت حاجی صاحبؒ کی ممانعت ہے تو میں اس کے خلاف مشورہ نہیں دیتا۔ چنانچہ دونوں حضرات کی دعا کی برکت سے قرضہ سے جلد سبکدوش ہو گئے۔

حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے والد ماجد کے ترکہ میں بعض مشتبہ اموال کو نہ لینا چاہا تو حضرت گنگوہیؒ نے یہی ارشاد فرمایا کہ اگر لو تو فتویٰ سے گنجائش ہے اور اگر نہ لو تو خدا تعالیٰ تم کو روزی سے پریشان نہ کرے گا۔ ان واقعات سے ظاہر ہے کہ حضرت حکیم الامتؒ کو حضرت گنگوہیؒ سے کس قدر عقیدت و محبت تھی۔ چنانچہ ارشاد فرمایا کہ لوگ حضرت مولانا گنگوہی کو خشک مزاج بتلاتے ہیں۔ کیونکہ یا تو کبھی ملے نہیں یا اگر ایک دو دفعہ ملے تو اتفاق سے ایسے وقت ملے کہ مولاناؒ کسی دوسرے شغل یا احتساب میں مشغول ہوتے اور ساری عمر کیلئے رائے قائم کر دی۔ اسکی ایسی مثال ہے کہ فلاں جج صاحب بڑے خوش اخلاق ہیں کا سن کر کوئی عدالت میں جاوے اور اتفاق سے ایسے وقت پہنچے کہ جج صاحب دو شخصوں کو حبس دوام کا حکم سنا رہے ہوں اور دو شخصوں کو پھانسی کا۔ تو یہ شخص جج صاحب کو نہایت درجہ کا خونخوار سمجھے گا، لیکن عقلمند یہی کہے گا کہ بھائی تم نے عدالت میں دیکھا ہے۔ پھر اتفاق سے اس وقت سنگین مقدمات پیش تھے، ذرا ان کے بنگلہ پر جا کر دیکھو۔ اسی طرح بزرگوں کے پاس ایک وقت جا کر دیکھا اور کہہ دیا کہ یہ نہایت خشک ہیں۔

حضرت امام ربانیؒ کی حضرت حکیم الامتؒ سے محبت

ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ کے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور حضرتؒ اس وقت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔

جب حضرت حکیم الامتؒ ملنے کیلئے تشریف لائے تو حضرت امام ربانیؒ چارپائی سے اتر کر نیچے تشریف لائے اور عام لوگوں میں آ بیٹھے۔ حضرت حکیم الامتؒ کو خجلت ہوئی اور عرض کیا کہ اب تو اکثر حاضری کا اتفاق ہوا کرے گا، میں تو خادموں کے طور پر حاضر ہوتا ہوں۔ خادموں کا سا برتاؤ فرمایا کریں۔ مولاناؒ نے یہ فرما کر حضرت حکیم الامتؒ کی خجلت دور فرمائی کہ نہیں میں دیر سے لیٹا ہوا تھا اس لئے آبیٹھا ہوں اور آئندہ خیال فرما کر نشست نہ بدلی۔

ایک مرتبہ تھانہ بھون کے کچھ لوگ حضرت گنگوہیؒ کے پاس حضرت حکیم الامتؒ سے شکایت کرنے لگے کہ ایسا کرتے ہیں ویسا کرتے ہیں اور ابھی نام ظاہر نہ کیا تھا۔ مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کس کی شکایت ہے۔ انہوں نے کہا مولانا اشرف علی صاحبؒ کی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ میں نہیں سننا چاہتا وہ جو کام کرتے ہیں حق سمجھ کر کرتے ہیں۔ نفسانیت سے نہیں کرتے۔ بشریت سے غلطی دوسری شے ہے، وہ سب اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ایک مرتبہ حضرت حکیم الامتؒ کا گنگوہ میں ایک مقام پر وعظ ہو رہا تھا۔ کچھ لوگ حضرت گنگوہیؒ کے پاس بیٹھے تھے جس میں حضرت امیر شاہ خاں صاحبؒ بھی تھے۔ حضرت گنگوہیؒ نے حاضرین سے غصہ ہو کر فرمایا کہ یہاں کیوں بیٹھے ہو ایک عالم ربانی کا وعظ ہو رہا ہے۔ اس کے وعظ میں جاؤ میرے پاس کیا رکھا ہے۔

حضرت امیر شاہ خاں صاحب مرحوم و مغفور فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ میں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اور جناب مولوی اشرف علی صاحبؒ بھی گنگوہ تشریف لائے ہوئے تھے، صبح کی نماز کے بعد آپ حضرت گنگوہیؒ سے کچھ پوچھتے ہوئے حضرت کیساتھ ساتھ حجرے تک تشریف لے گئے اور سہ دری میں پہنچ کر دونوں حضرات کھڑے ہو گئے اور کچھ دیر تک کھڑے کھڑے گفتگو ہوتی رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جبکہ مولانا اور حضرت سے مولود وغیرہ کے باب میں مکاتبت ہوئی تھی اور مجھے حضرت مولانا سے اپنے مسلک سابق کی وجہ سے عقیدت نہ تھی جبکہ میں نے حضرت گنگوہیؒ کا حضرت مولانا تھانویؒ سے اس خصوصیت کا برتاؤ دیکھا تو حضرت قدس سرہٗ سے دریافت کیا، کیا مولوی اشرف علی صاحبؒ اچھے ہو گئے آپ نے فرمایا کہ ہاں اچھے ہو گئے میں نے پھر پوچھا کیا بالکل اچھے ہو گئے۔ مولانا نے تیز لہجہ میں فرمایا ہاں بالکل اچھے ہو گئے۔ ان چند واقعات سے حضرت گنگوہیؒ کی حضرت حکیم الامتؒ سے محبت ولحاظ کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

محبت کی برکت | حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں کہ آپکی صحبت میں یہ اثر تھا کہ کیسی ہی

پریشانی یا وساوس کی کثرت کیوں نہ ہو جونہی آپکی صحبت میں بیٹھے قلب میں ایک خاص قسم کا سکون اور جمعیت حاصل ہوتی جس سے سب کدورتیں رفع ہوگئیں اور قریب قریب آپکے کل مریدوں میں عقاید کی درستی، دین کی پختگی خصوصاً حب فی اللہ و لبغض فی اللہ بدرجہ کمال مشاہدہ کیا جاتا ہے یہ سب برکت آپکی صحبت کی ہے۔

اس مکاتبت کا نام ضیاء الافہام من علوم بعض الاعلام ہے حضرت حکیم الامتؒ غلو عن المنکرات مباح سمجھتے تھے۔ حضرت گنگوہیؒ بہ اندیشہ فساد منع فرماتے تھے۔ بالآخر حضرت حکیم الامتؒ نے اپنے قول سے رجوع کیا تفصیل تذکرۃ الرشید میں ہے۔

ملفوظات | اب چونکہ حضرت گنگوہیؒ اس دار فانی سے عالم جاودانی تشریف لے گئے اس لئے اب ہمیں ان کی صحبت میسر نہیں ہو سکتی، ان کے ملفوظات ہی ہمارے لئے موجب تسکین ہیں ؂

چونکہ گل رفت و گلستاں شد خراب بوئے گل را از کہ جوئیم از گلاب

چونکہ شد خورشید ما را کرد داغ چارہ نبود در مقامش جز چراغ

حضرت حکیم الامتؒ خلیفہ خاص حضرت حاجی صاحبؒ خواجہ تاش حضرت گنگوہیؒ کی زبانی حضرت امام ربانیؒ کے ملفوظات ملاحظہ فرمائیے ؛ وَاللّٰہُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝ - آمین -

ملفوظات

۱۔ فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ فرماتے تھے کہ جو لوگ علمائے دین کی توہین اور ان پر طعن و تشنیع کرتے ہیں، قبر میں ان کا منہ قبلہ سے پھر جاتا ہے اور یہ بھی فرمایا کہ جس کا جی چاہے دیکھ لے۔ (ملفوظات کمالات اشرفیہ صہ ۵۴)

۲۔ فرمایا : کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے یہاں اہل باطل کے تکفیر کا ذکر تھا۔ اسی روز جوش میں شان رحیمی کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہاں تک فرمایا کیا کافر کافر لئے پھرتے ہو۔ قیامت میں دیکھو گے کہ ایسوں کی مغفرت ہوگی جنہیں تم دنیا میں کافر قطعی کہتے ہو اور واقع میں وہ کافر نہ ہوں گے مگر نہایت ضعیف الایمان ہوں گے۔ پھر فرمایا لیکن اگر ڈرانے دھمکانے کیلئے شرعی انتظام کیلئے کسی وقت کافر کہہ دیا جاوے تو اس کا مضائقہ نہیں۔ اس میں شان انتظامی کا ظہور ہو گیا۔ (کمالات اشرفیہ صہ ۹۲)

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحبؒ فرماتے تھے کہ جس قدر نظر وسیع ہو جاتی ہے، اعتراض کم ہو جاتا ہے چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحبؒ کے اندر اس قدر حسن ظن

تھا کہ کہیں نہ دیکھا۔ (ارواحِ ثلاثہ صـ۲۲۸) یہ ملفوظ حضرت گنگوہیؒ کی وسیع النظری کا شاہد ہے اور بے مثال حسنِ ظن کی دلیل ہے۔

۳۔ فرمایا: کہ ایک بار حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا کہ کسی سے کسی قسم کی توقع مت رکھو چنانچہ مجھ سے بھی مت رکھو۔ یہ بات دین و دنیا کا گر ہے جس شخص کی یہ حالت ہوگی وہ افکار و ہموم سے نجات پاتے گا۔ (کمالاتِ اشرفیہ صـ۱۲۷) غیبت جیسا گناہ کبیرہ بھی توقع سے ہوتا ہے کیونکہ انسان اسی کی غیبت کرتا ہے جس سے توقع رکھی ہوئی تھی۔ مرزا غالب مرحوم نے سچ فرمایا ہے ۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ　　کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

۴: فرمایا: کہ تہذیب اس کا نام ہے کہ بناوٹ نہ ہو۔ چنانچہ گاؤں کے لوگ نہایت مخلص ہوتے ہیں۔ نانوتہ کے پاس آبہہ ایک گاؤں ہے۔ حضرت حاجی صاحبؒ وہاں عرصہ تک قیام فرمارہے۔ حضرت مولانا گنگوہیؒ بھی اس موضع میں حضرت حاجی صاحبؒ کے ہمراہ تشریف لے جایا کرتے تھے۔ اس گاؤں سے لوگ آتے ہیں اور ان کو یہاں قیام کرنا ہوتا ہے تو صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم اتنے آدمی ہیں اور رات کو قیام کریں گے۔ میں اس بات کی بڑی قدر کرتا ہوں، میں ان کی چیز واپس نہیں کرتا۔ ان میں کوئی بناوٹ نہیں ہوتی۔ پہلے آبہہ کے لوگ جمعہ پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت مولانا گنگوہیؒ نے فرمایا آبہہ ہمارا ہی ہے، اور پھر ہمارے مسلک کے خلاف جمعہ پڑھتے ہیں۔ یہ خبر گاؤں میں پہنچی تو سب نے جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ (کمالاتِ اشرفیہ صـ۱۳۱) حضرت گنگوہیؒ کے فتویٰ پر تمام دنیا بے چوں وچرا عمل کرتی تھی۔ سب کو آپ کے فتویٰ پر یقین تھا۔

۵۔ فرمایا: ایک صاحب نے حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ سے سوال کیا کہ جو سائل جوان ہٹا کٹا ہو اسکو بھیک دینا کیسا ہے؟ فرمایا یوں کہہ دو کہ آگے جاؤ یا خاموش رہو، خود ہی چلا جاوے گا۔ پھر فرمایا کہ اگر لوگ نہ دینے پر پورا عمل کریں تو ایسے لوگ مانگنا ہی چھوڑ دیں۔ بھیک مانگنے والے جو قادر ہوں کسب پر، فقہا نے ان کو دینا حرام لکھا ہے۔ کیونکہ سوال کرنا ایسے شخص کو حرام ہے اور بھیک دینا یہ اعانت ہے معصیت پر اس لئے وہ بھی حرام ہے اور دلیل یہ ہے: لَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ (یعنی گناہ اور ظلم کے لئے مدد نہ کرو) مولانا گنگوہیؒ نے اس مسئلہ کو بیان فرمادیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ لوگ غل تو مچاویں گے مگر　　دیتا ہوں۔ چنانچہ بڑا غل مچا۔ بات یہ ہے کہ مانگنا رسم ہوگیا ہے اور رسم کے خلاف لوگ نہیں مانتے (کمالاتِ اشرفیہ صـ۱۳۳) اللہ تعالیٰ ہمیں رسوم سے بچائیں اور سنت پر عمل کی توفیق بخشیں۔ آمین

۶۔ فرمایا، کہ مولانا گنگوہیؒ نے ایک جگہ قسم کھائی ہے کہ مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے۔ محض احباب کا حسنِ ظن ہے جو میرے ساتھ ہے۔ بعض مخلص لوگوں کو اس میں شک ہو گیا کہ مولانا میں کمال کا ہونا تو ظاہر ہے تو اس قول سے مولاناؒ کا جھوٹ بولنا لازم آتا ہے۔ پھر ہمارے حضرتؒ حکیم الامتؒ نے مولاناؒ کے قول کی تفسیر میں فرمایا کہ بزرگوں کو آئندہ کمالات کی طلب میں موجودہ کمالات پر نظر نہیں ہوتی پس مولانا اپنے کمالات موجودہ کو کمالات آئندہ کے سامنے نفی خیال فرماتے تھے۔ اسکی ایسی مثال ہے کہ کسی شخص کے پاس ایک ہزار روپے ہیں، وہ لکھ پتیوں کے سامنے مالدار نہیں۔ البتہ دوسرے شخصوں کو مولاناؒ کی نسبت یہ گمان کہ وہ خالی از کمالات تھے، نہ کرنا چاہئے (کمالات اشرفیہ صـ۱۹۱، اشرف السوانح ج ا صـ۴۲۹) حق تعالیٰ شانہٗ کی بڑی عظیم الشان بے مثال درگاہ ہے۔ یہاں سے جو کچھ عطا ہو۔ آگے کی ہوس کرنا چاہئے۔ کسی ایک مقام پر بس نہیں کرنا چاہئے ؎

اے برادر بے نہایت درگہیست ہر کہ بروے میرسی بروے

۷۔ فرمایا کہ میں نے حضرت مولانا گنگوہیؒ سے پوچھا کہ میرا جی تنہائی کو بہت چاہتا ہے لیکن اس میں لوگوں کی دل شکنی کا بہت خیال ہوتا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ اپنی مصلحت دیکھ لو اور کسی کا خیال نہ کرو۔ سب کو جھاڑ بھی، مارو بھی۔ یہ اس طرح فرمایا کہ گویا خود پر بھی گذر رہی ہو۔ (کمالات اشرفیہ صـ۲۱۸ و اشرف السوانح ج ا صـ۳۸۲)

۸۔ فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا یہ قول مجھے بہت ہی پسند ہے کیونکہ میرے مذاق کے موافق ہے وہ یہ کہ تحمل سے زیادہ کبھی اپنے ذمہ کام نہ لے چنانچہ ایک صاحب نے مولانا (حکیم الامتؒ) کے کسی مہمان سے بستر کیلئے پوچھا تو معلوم ہونے کے بعد فرمایا کہ اگر اس کے پاس نہ ہوتا تو تم کہاں سے دیتے اور اگر ایک دو بستر کہیں سے لا بھی دیئے تو اگر بہت سے مہمان آتے اور کسی کے پاس بھی بستر نہ ہو تو سب کیلئے کہاں سے لاؤ گے۔ خبردار جو کسی سے بستر کیلئے پوچھا۔ (کمالات اشرفیہ صـ۲۱۸)

۹۔ فرمایا مولانا محمد قاسم صاحبؒ کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہوتا تو اشراق اور چاشت بھی قضا کر دیتے تھے اور مولانا رشید احمد صاحبؒ کی اور شان تھی۔ کوئی بیٹھا ہو جب اشراق کا یا چاشت کا وقت آیا وضو کر کے وہیں نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے۔ یہ بھی نہیں کہ کچھ کہہ کر اٹھیں کہ میں نماز پڑھ لوں یا اٹھنے کی اجازت لیں، جہاں کھانے کا وقت آیا لکڑی لی اور چل دیئے چاہے کوئی نواب ہی کا بچہ بیٹھا ہو۔ وہاں یہ شان تھی جیسے بادشاہوں کی شان ہوتی ہے۔ ایک تو بات ہی کم کرتے تھے اور اگر کچھ مختصر سی بات کہی تو جلدی سے ختم کر کے تسبیح لے کر ذکر میں مشغول ہو گئے۔ کسی نے کوئی بات پوچھی تو جواب

دے دیا گیا اور اگر نہ پوچھی تو کوئی گھنٹوں بیٹھا رہے۔ انہیں کچھ مطلب نہیں۔ مولانا قاسم صاحبؒ کے پاس جب تک کوئی بیٹھا رہتا بولتے رہتے۔ (کمالات اشرفیہ ص۲۲۶)

۱۰۔ فرمایا کہ ایک بار مولانا محمد قاسم صاحبؒ مولانا گنگوہیؒ سے فرمانے لگے کہ ایک بات پر بڑا رشک آتا ہے کہ آپ کی نظر فقہ پر بہت اچھی ہے۔ ہماری نظر ایسی نہیں، بولے جی ہاں ہمیں کچھ جزئیات یاد ہو گئیں تو آپ کو رشک ہونے لگا اور آپ مجتہد بنے بیٹھے ہیں۔ ہم نے کبھی آپ پر رشک نہیں کیا۔ ایسی ایسی باتیں ہوا کرتی تھیں، وہ انہیں اپنے سے بڑا سمجھتے اور وہ انہیں۔ (کمالات اشرفیہ ص۲۲۶)

۱۱۔ فرمایا مولانا محمد قاسم صاحبؒ اور مولانا رشید احمد صاحب حج کو چلے تو بمبئی میں مولانا محمد قاسم صاحبؒ تو لوگوں سے ملتے پھرتے اور مولانا گنگوہیؒ انتظام میں مشغول رہتے مولانا محمد قاسم صاحبؒ واپس آتے تو مولانا گنگوہیؒ فرماتے کچھ فکر بھی ہے کہ کیا انتظام کرنا چاہئے۔ مولاناؒ فرماتے کہ مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے جب آپ بڑے سر پر موجود ہیں۔ (کمالات اشرفیہ ص۲۲۶)

۱۲۔ فرمایا کہ میں نے اپنے کسی بزرگ کی خدمت ہاتھ پاؤں (دبانے) کی کبھی نہیں کی کہ شاید مجھ سے نہ آوے تو انہیں تکلیف ہو عمر بھر میں ایک دفعہ مولانا گنگوہیؒ کو پنکھا جھلنے بیٹھا تھا۔ اس وقت مولاناؒ اور میں اکیلے تھے، کبھی یہ کام کیا نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں مونڈھے دکھنے لگے۔ اب اور کوئی دوسرا وہاں نہ تھا کہ اسکو دے دوں اور موقوف کر دینا برا معلوم ہوا۔ جی چاہا کہ کوئی آجاوے تو اچھا ہو۔ چنانچہ ایک صاحب آ گئے، میں نے ان کے حوالے کر دیا اور جی میں کہا کہ توبہ ہے جو اب پنکھا جھلوں، نہ ہمارے بزرگوں کو کبھی اس کا خیال ہوا، اب جیسا برتاؤ بزرگوں کا دیکھا ویسے ہی کرنے کو جی چاہتا ہے (ایضاً ص۲۲۵)

۱۳۔ فرمایا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ سے سنا ہے کہ یاجوج ماجوج کی تبلیغ ہو چکی ہے اس لئے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رات بھر اس دیوار کو چاٹتے ہیں اور کھودتے ہیں جو ان کے درمیان حائل ہے۔ جب وقت آوے گا تو یہ کہیں گے کہ انشاء اللہ کل اس کو ختم کر دیں گے۔ انشاء اللہ کہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اللہ کا نام معلوم اور تبلیغ ہو چکی ہے۔ یہ نئی بات معلوم ہوئی۔ پہلے سے معلوم نہ تھی۔ (کمالات اشرفیہ ص۲۲۶) اس حدیث سے حضرت گنگوہیؒ کے حدیث کا عمیق النظری اور غور و فکر سے مطالعہ کر کے عجیب استدلال کرنا معلوم ہوا۔

۱۴۔ فرمایا حضرت مولانا گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر ہم کو پہلے سے خبر ہوتی کہ تصوف میں آخر میں کیا چیز حاصل ہوتی ہے تو میاں ہم کچھ بھی نہ کرتے۔ مدتوں کے بعد معلوم ہوا کہ جس کیلئے اتنے مجاہدات اور ریاضت کئے تھے۔ وہ ذرا سی بات ہے۔ حضرتؒ نے تو اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے

اس ذراسی بات کو نہیں تبلایا، میں اپنی کم ظرفی سے تبلاتا ہوں کہ وہ ذراسی چیز ہے کیا جسکو حاصل کرنے کیلئے اتنی محنتیں کرنی پڑتی ہیں وہ یہی ہے جسکو میں نے تبدیل ثانی کے عنوان سے بیان کیا ہے کیونکہ یہی ہے پیدا کرنے والی تعلق مع اللہ کی اور یہی ہے محافظ تعلق مع اللہ کی اور یہی ہے بڑھانے والی تعلق مع اللہ کی۔ غرض وہ ذراسی بات جو تصوف کا حاصل ہے یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو سستی کا مقابلہ کرکے اس طاعت کو کرے اور جسکو یہ بات حاصل ہوگئی اسکو پھر ضرورت نہیں، نہ شیخ کی نہ سید کی نہ مغل کی نہ پٹھان کی۔ نہیں تو چاروں ذاتوں کی ضرورت ہے ۔

کشند از برائے دے بار ہا　　خورند از برائے گلے خار ہا

شیخ کا بس یہی کام ہے کہ اسی ذراسی بات کے حاصل کرنے کی تدبیریں تبلاتا ہے اور کچھ نہیں کرتا۔ بدوں شیخ کے اس کا حصول متعذر ہے۔ قدم قدم پر گاڑی اٹکے گی یہ پتہ نہ چلے گا کہ ادھر جاؤں یا ادھر۔ دونوں چیزیں ایک نظر آئیں گی ۔

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں　　درمیان شان برزخ لا یبغیان

۱۵۔ فرمایا : مولانا گنگوہی کا دیکھئے کیا طرز تھا۔ درس حدیث کیلئے نہ کوئی مکان تھا، نہ مدرسہ تھا، کچھ مساجد میں رہتے تھے کچھ وہاں ہی کے حجروں میں، جن میں سے بعض حجرہ کی چھت ایسی کہ کہیں گر نہ جاتے۔ ساری عمر اسی طرح گزار دی۔ (کمالات اشرفیہ ص ۲۰۳)

۱۶۔ فرمایا : مولانا گنگوہی کے یہاں ایک رئیس نے طلبہ کیلئے روپیہ بھیجا۔ درس ملتوی ہو چکا تھا۔ حضرت نے واپس فرما دیا۔ اور فرمایا کہ جس کام کیلئے بھیجا ہے وہ یہاں ہے نہیں اس لئے واپس ورنہ ممکن تھا کہ اور کسی کام کیلئے مشورہ دیا جاتا تو وہ رئیس ضرور قبول فرما لیتے۔ (کمالات اشرفیہ ص ۲۰۳)

۱۷۔ فرمایا : جب گنگوہ میں جامع مسجد کی تعمیر ہو رہی تھی تو ایک رئیس نے حضرت کو یہ لکھ کر بھیجا تھا کہ اس کام کا تخمینہ کرا کے اطلاع فرما دیں۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ میرے پاس کوئی انجینئر نہیں ہے۔ اگر دل چاہے اپنا آدمی بھیج کر تخمینہ کرا لیجئے۔ صاف جواب دے دیا۔ یہ زندگی تھی ہمارے حضرات کی۔ پھر سلف صالحین کا یہ طرز نہیں تھا مگر اب ضرورت ہے اس طرز کی، لیکن ہمارے حضرات نے اس ضرورت کے زمانہ میں بھی طرز سلف کر دکھایا۔ ہم چونکہ ضعفاء ہیں اس لئے اسباب کے ساتھ تشبث رکھنے کی ضرورت ہے۔ (کمالات اشرفیہ ص ۲۰۳)

۱۸۔ فرمایا : حضرت حافظ ضامن صاحب کے ایک خلیفہ تھے، ان کے یہاں ایک مرتبہ چوری ہو گئی۔ ان صاحب کا رئیسانہ مزاج تھا مگر تھے اہل نسبت۔ ان کے سامنے کسی نے ایک جولاہا کا نام

ے دیا۔ وہ نمازی تھا، مگر کم وقعت تھا۔ ان صاحب نے ان کو بلایا وہ ڈر گیا اور باتیں دریافت کرتے وقت خوف کی وجہ سے اس کے کلام میں لغزش ہوئی۔ اسکی وجہ سے اس پر کچھ شبہ ہوا اور ان صاحب نے اسکو مارا۔ وہ مولانا گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا مولاناؒ کو بہت ناگوار ہوا۔ بس مولاناؒ نے ان صاحب کو رقعہ لکھا کہ اگر خدا تعالیٰ آپ سے سوال کریں کہ آپ نے اس غریب کو کس حجت شرعیہ سے مارا تو آپ کے پاس کچھ جواب ہے، اس جواب کو آپ تیار کرلیں۔ اس رقعہ کو سن کر ان صاحب کا سر سے پاؤں تک سناٹا نکل گیا۔ پس گنگوہ پیدل پہنچے۔ مولاناؒ اس وقت حجرے میں لیٹے تھے۔ باہر ایک طالب علم بیٹھے تھے۔ ان صاحب نے ان طالب علم سے کہا کہ مولاناؒ کو اطلاع کردو کہ ایک ناپاک کتا آیا ہے اگر منہ دکھانے کے قابل ہو تو منہ دکھاوے ورنہ کسی کنویں میں ڈوب مرے تاکہ یہ عالم پاک ہو۔ طالب علم نے اطلاع کی۔ مولاناؒ نے بلالیا۔ ان صاحب نے کہا حضرتؒ میں تو تباہ ہوگیا۔ مولاناؒ نے فرمایا کیوں قصہ پھیلایا ہے۔ گناہ ہوگیا تو توبہ کرلو یہی علاج ہے۔ حضرت حکیم الامتؒ نے فرمایا بعض دفعہ ایک شیخ دوسرے شیخ کے سامنے مبتدی ہوجاتا ہے۔ (کمالات اشرفیہ ص۳۲۹)

۱۹۔ فرمایا: کہ مجھے توسل کے مسئلہ میں اشکال تھا۔ اسکو حل کرنے کیلئے حضرت گنگوہیؒ کی خدمت میں گنگوہ حاضر ہوا۔ (یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت گنگوہیؒ کی بینائی نہ رہی تھی) سلام کے بعد میں نے اس خیال سے کہ حضرت (گنگوہیؒ) نے سلام کی آواز سے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ عرض کیا کہ توسل کے مسئلہ میں کچھ پوچھنا ہے۔ فرمایا کہ کون پوچھتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اشرف علی۔ فرمایا کہ تعجب ہے۔ بس اتنی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد مجھے بھی کچھ عرض کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور واپس تھانہ بھون آگیا۔ مگر اس مسئلہ میں ایسا شرح صدر ہوا کہ کوئی اشکال اور کھٹک باقی نہ رہی۔ میں نے اس مسئلہ میں ایک رسالہ تصنیف کیا اس میں مسئلہ توسل کو خوب شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے (اس رسالہ کا نام الادراک والتوصل الی حقیقتہ الاشراک والتوسل ہے) اس واقعہ کو بیان فرمانے کے بعد حضرت حکیم الامتؒ یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ (القول العزیز ص۱۰۲)

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل و قال

۲۰۔ فرمایا: حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک ذاکر کو تقلیل غذا سے منع فرمایا تھا۔ انہوں نے اپنے کچھ حالات بیان کئے تو مولاناؒ نے فرمایا کہ دماغ میں پیس آگیا ہے، جنون کا مقدمہ ہے۔ تم تقلیل غذا موقوف کردو اور دماغ کا علاج کرو۔ مگر وہ تو ان کشفیات کو کمال سمجھے ہوئے تھے۔ اس لئے مولاناؒ کے قول پر اعتماد نہ کیا، بالآخر جنون ہوگیا اور سارے اذکار و اشغال موقوف ہوگئے پھر یہ حالت

حتی کہ بالکل ننگے بیٹھا کرتے تھے۔ اس لئے میں کہتا ہوں کہ اپنے اعضاء کو سرکاری مشین سمجھ کر کبھی تیل بھی دیا کرو، دودھ گھی بھی کھایا کرو۔ اس حیثیت سے ان کی محبت کرنا حفاظت کرنا اور جب ان سے خدا تعالیٰ کے احکام کی تعمیل ہو جائے تو اس پر ان کی تعریف کرنا سب محمود ہے۔ یہی مطلب ہے اس شعر کا ۔ (العید والوعید ص۴۰)

شکر للہ کہ نمردیم و رسیدیم بدوست　　آفریں باد بریں ہمت مردانہ ما

۴۱۔ فرمایا: آجکل یہ مصیبت عام ہو رہی ہے کہ قضاء اور خطابت میں بھی میراث چلنے لگی ہے کہ قاضی کی اولاد قاضی اور خطیب کی اولاد خطیب چاہے علم اور دین سے کورے ہی ہوں۔ گنگوہ میں ایک جاہل قاضی تھے، انہوں نے مولانا گنگوہیؒ کی نقل اتارنا چاہا۔ مولاناؒ کی عادت تھی کہ عیدین کے خطبہ میں کچھ مسائل صدقہ و فطر اور قربانی کے متعلق بیان فرما دیا کرتے تھے۔ قاضی صاحب نے سوچا ہم مولاناؒ سے کسی بات میں کم کیوں رہیں۔ ہم بھی مسائل بیان کریں گے تو آپ نے مسئلہ بیان کیا کہ قربانی میں گائے پورے سال بھر کی ہونا چاہئے اور نہ معلوم کیا گڑبڑ کی کہ لوگ ہنس پڑے کہ جاہل کو مسائل تو معلوم نہیں، مولاناؒ کی ریس کرتا ہے، مگر اس پر بھی وہ قاضی بنے ہوئے تھے، کیونکہ قاضی کی اولاد میں تھے۔ حیرت ہے کہ ان باتوں میں تو میراث چلتی ہے اور اس میں میراث نہیں چلتی کہ باپ لنگڑا ہو تو بیٹا بھی لنگڑا ہو اور اگر صحیح سالم ہو تو لنگڑا بن جایا کرے اور اگر باپ آنکھوں کے حافظ جی ہوں تو لڑکا بھی حافظ ہو یعنی اندھا ہو کیونکہ عرف میں ہر اندھے کو حافظ ہی کہتے ہیں۔ (اصلاح ذات البین ص۱۲)

جناب محمد حفیظ اللہ پھلواروی۔ کراچی
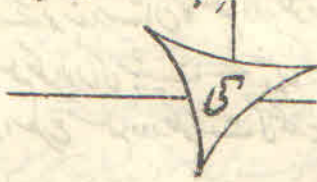
مسلمان بادشاہوں نے جس شان و شوکت کے ساتھ برصغیر پاکستان وہند پر حکومت کی اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ ان کی حکومت کی نمایاں خصوصیت رعایا کی فلاح و بہبود خوش حالی و فارغ البالی اور مذہبی رواداری تھی۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مسلم شاہانِ برصغیر کے دورِ حکومت میں اس کی سرزمین خیر و برکت سے معمور تھی اور میجر کے الفاظ میں رعایا کی خوشحالی اور دولت مندی کے اعتبار سے بھی مسلمانوں کا دورِ حکومت سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

ٹیونیر، کیپٹن ہاکن، سرٹامس رو، سرجان لنکاشر مسلم فرمانروایانِ ہند و پاکستان کے زمانے میں آئے تو یہاں کی رعایا کی خوشحالی، دولت اور فروغ کو دیکھ کر حیرت میں آگئے۔ یہاں کے بے شمار خزانے، سونا، چاندی، زیورات اور موتیوں کو دیکھ کر مشہور سیاح کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ ہند و پاکستان کے عظیم الشان شہروں کو دیکھ کر انگلستان کے لوگ مرعوب ہوتے تھے۔

اودن سڈنی کا بیان ہے کہ جہانگیر کے عہد میں برصغیر ہند و پاکستان کے باہر کی دنیا جس میں یورپ بھی داخل ہے۔ سلطنت مغلیہ کے شاندار نظام حکومت کو دیکھ کر عش عش کرتی اور مرعوب ہو جاتی تھی۔

جنوبی ہند کا ایک نامور اہل قلم ونکٹا راجگوان کا بیان ہے کہ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں جو یورپین سیاح ہندوستان آتے رہے ہیں۔ ان سب نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اسوقت ہندوستان ہر لحاظ سے ترقی یافتہ تھا اور ملک کا نظم و نسق عمدہ اور مستحکم تھا۔ مختلف حرفتیں ترقی کر رہی تھیں اور غیر ملکوں کے ساتھ تجارت نے اس ملک کے باشندوں کی خوشحالی کو قابلِ رشک بنا دیا تھا۔

ان تاریخی شہادتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کو انگریزوں کے دورِ حکومت

کے درجہ میں رکھنا اور اس مفروضہ کی بنیاد پر ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف غلط فہمیاں پھیلانا تاریخ کو جھٹلانا ہی نہیں بلکہ ملک کو نقصان پہنچانا بھی ہے۔

اگر تعصب سے بالاتر ہو کر دیکھا جائے تو ہندوستان کا مسلم دورِ حکومت اس ملک میں ایک قومی حکومت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور مسلم حکمرانوں کی حیثیت سے نہیں بلکہ سچے محبانِ وطن کی حیثیت سے اس ملک کو ترقی دی تھی اور اسطرح مسلم دورِ حکومت کی تکذیب کرنا خود اپنی خوبیوں پر پانی پھیرنے کے ہم معنی ہے۔

بقول پروفیسر وی۔اے۔ اسمتھ دوسری قومیں ہندوستان میں آکر تھوڑے دنوں تک حکمرانی کے بعد ہندو قوم میں جذب ہوگئیں اور ان کی کوئی اپنی قومیت نہ رہی، لیکن برخلاف اس کے پروفیسر ایل مکرجی کے بیان کے مطابق مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو اپنا ایک تمدن لائے جس نے ملک کو بے حد متاثر کیا۔

مسلم شاہانِ ہندو پاکستان کی غیر مسلم رعایا کا مذہب، ان کی جانیں، ان کی دولت و جائداد اور ان کی عزت و آبرو، غرض ہر چیز محفوظ تھی۔ نیز وہ اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے — مذہبی تفریق نام کے لئے بھی نہ تھی۔

مشہور ہندو مؤرخ پروفیسر الیشوری پرشاد کا بیان ہے کہ جس زمانہ میں ہندوستان پر مسلمان بڑی رواداری کے ساتھ حکومت کر رہے تھے، اسی زمانہ میں رومن کیتھولک، غیر مذاہب کے لوگوں پر بڑے بڑے مظالم اور سفاکیاں کر رہے تھے۔ خیالات کی آزادی اور مذہبی حریت کا تو گلا ہی گھونٹ دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کا سلوک مغربی اقوام کے مقابلہ میں کہیں بہتر تھا۔ مسلمانوں نے مذہبی معاملات میں کبھی جبر سے کام نہیں لیا۔

یہ انتہائی ناانصافی کی بات ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو بدنام کرنے کے لئے کسی واقعہ کو غلط صورت میں پیش کر کے عام انداز میں یہ کہا جائے کہ مسلمانوں کے عہد میں غیر مسلموں کو نہ مذہبی آزادی حاصل تھی نہ مساوی حقوق حاصل تھے، اور نہ ان کی عزت آبرو محفوظ تھی۔ نیز ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ وہ زبردستی مسلمان بنائے جاتے تھے، اور ان کے عبادت خانے مسمار کر دیئے جاتے تھے۔ حیرت ہے کہ یہ لغو اور بے سروپا الزامات اُن مسلمان بادشاہوں پر لگائے جاتے ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن سمجھا اور یہاں کی مذہبی زندگی اور خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا، جنہوں نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے عطا کئے، جنہوں نے ہندوؤں کے عبادت خانوں

کے لئے بڑے بڑے وقف جاری کئے، جنہوں نے ہندوؤں کو نہتّا نہیں کیا، بلکہ اسلحہ رکھنے کی عام اجازت دی جنہوں نے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں پڑھیں اور ان کی فراہمی اور حفاظت میں کوشش بلیغ کی، جنہوں نے ہندوؤں کے علوم و ادب کو فروغ دے کر ان کو دنیا سے روشناس کرایا جنہوں نے صدیوں تک ہندوستان میں حکومت کی اور جو اپنے عدل و انصاف، پاکیزہ نظم و نسق اور مذہبی رواداریوں کے غیر فانی نقوش اپنے بعد چھوڑ گئے۔

مسلم دورِ حکومت میں مسلمانوں کیطرح غیر مسلم اقوام کو بھی اپنے فرائض مذہبی کے ادا کرنے میں پوری آزادی حاصل تھی۔ مذہبی تیوہار، قدیم دستور کے مطابق دھوم دھام اور شان و شوکت سے منائے جاتے تھے اور مسلمانوں کی جانب سے کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ الہ آباد کے پنڈت سندر لال صاحب "بھارت میں انگریزی راج" میں لکھتے ہیں:

"دلّی کے مغل دربار کے اندر ہندو اور مسلمانوں کے خاص خاص تیوہار برابر جوش و خروش کے ساتھ منائے جاتے تھے۔"

مخالفین اور موافقین مؤرخین کی مستند تاریخوں کی ورق گردانی کر جائیے۔ ایک واقعہ بھی ایسا نظر سے نہ گذرے گا جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہندوؤں نے سر زمین ہند میں اپنی غالب اکثریت کے باوجود من حیث القوم مسلمان حکمرانوں کے خلاف کوئی مذہبی بغاوت کی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ کے ہندو مسلم دورِ حکومت سے پوری طرح مطمئن تھے۔ ان کو مسلم دورِ حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی زندگی کے آخری ۲۵ سال دکن میں گذرے، اور وہاں وہ مصروفِ جنگ رہا، لیکن اس کے دار السلطنت میں نہ ہندوؤں نے بغاوت کی اور نہ کوئی شورش پیدا ہوئی۔

بعض متعصب اور تنگ دل اہلِ قلم خود ساختہ کہانیوں کی تلاش میں رہتے ہیں، جن میں واقعات اور تاریخ کی طرف سے آنکھیں بند کر کے گزشتہ دور کے عدل و انصاف اور رواداری کے خلاف خوب زہر اگلا جاتا ہے، اور تاریخ کی صورت کو زیادہ سے زیادہ مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ غیر مسلم رعایا کو جو مسلمانوں کی سلطنت میں آسودہ اور خوشحال تھی، مظلوم اور جبر و استبداد کی شکایت کا شکار بنا کر دکھایا جاتا ہے۔ تاکہ اسطرح شاہانِ ہند و پاکستان کو بدنام اور رسوا کیا جائے۔ یہ طریق کار مذموم ہی نہیں، بلکہ کھلی ہوئی بد دیانتی ہے۔

مسلم دورِ حکومت کی تاریخ کے مطالعہ کے بعد کوئی بھی منصف مزاج شخص یہ نہیں کہہ سکتا

کہ کسی زمانہ میں بھی اپنے دورِ حکومت میں فرقہ پرستی یا مذہبی تنگ نظری سے کام لیا، بلکہ اگر بغور دیکھا جائے تو ان کا دورِ حکومت زمانہ حاضرہ کی اکثر و بیشتر جمہوری اور لادینی حکومتوں سے بھی بہتر تھا۔ اگر مسلمان اسطرح رواداری سے کام نہ لیتے تو یہ ناممکن تھا کہ وہ پورے ایک ہزار برس تک برِ عظیم پاک و ہند کی اکثریت پر اس امن و امان کے ساتھ حکومت کر سکتے ــــ ہندوستان کے مؤرخ لالہ ایشوری پرشاد کا کہنا ہے کہ :

"اگر مسلمان تنگ نظری اور فرقہ پرستی سے کام لیتے تو وہ اتنی طویل حد تک ہندوستان پر حکومت نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ مسلم اقلیت ہندو اکثریت پر ظلم اور زیادتی کرے اور اکثریت اُسے صدیوں تک برداشت کرتی رہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی پالیسی اوّل سے لیکر آخر تک رواداری پر مبنی رہی ہے۔ انہوں نے ہندوؤں کے معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی۔ کسی ایک ہندو کو بھی محض ہندو ہونے کے جرم میں نہیں ستایا، بلکہ مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ وہ اس ملک کے غیر مسلموں کی ہمدردیاں زیادہ سے زیادہ حاصل کریں۔"

بنگال کے مشہور اہل قلم اچاریہ پرفلا چندر رائے اپنے ایک محققانہ مضمون میں لکھتے ہیں کہ :ــــ

"بیسویں صدی سے پہلے کا ہندوستان ایک ایسا ہندوستان تھا جس میں فرقہ پرستی اور مذہبی تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا۔"

چنانچہ الفنسٹن لکھتا ہے : "علاؤالدین خلجی کہا کرتا تھا کہ مذہب کا ملک کی حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، مذہب صرف انسان کی نجی زندگی سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ قلبی سکون کا ایک ذریعہ ہے۔"

آگے چل کر پرفلا صاحب لکھتے ہیں کہ : "چودہویں صدی عیسوی تک مسلمانوں کی حکومت نہ صرف شمالی ہند میں بلکہ دکن میں بھی اچھی طرح جم گئی تھی۔ اس زمانہ سے لے کر بیسویں صدی کے شروع تک (یعنی انگریزوں کی آمد تک) چھ سو برس کی ہندوستان کی تاریخ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس طویل زمانہ میں اس ملک کے اندر تعصب یا فرقہ پرستی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ یہ بات بظاہر بڑی عجیب معلوم ہوگی، لیکن بات یہی ہے کہ تعصب اور تنگ نظری ابھی حال ہی کی پیداوار ہے جس

کا سیاسی اغراض کے لئے سہارا لیا گیا۔

مسلمانوں کے دورِ حکومت کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے مشہور انگریز مورخ الفنسٹن اپنی کتاب "ہسٹری آف انڈیا" میں لکھتا ہے کہ :

"بعض مسلم حکمرانوں کے زمانہ میں ہندوؤں کو جزیہ تو دینا پڑتا تھا۔ لیکن مسلمان ان کے مذہب اور مذہبی فرائض کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتے تھے۔ انہیں مذہبی اختلاف کی بناء پر کوئی تکلیف نہیں دی جاتی تھی۔ ہندو فوجوں کے بڑے بڑے افسر اور دیوانی نیز مالی محکموں کے ذمہ دار عہدوں پر مقرر کئے جاتے تھے۔"

مسلمانوں کی حکومت غیر ملکی نہیں تھی | مسلمانوں نے برِّصغیر ہندو پاکستان میں زبردست حکومتیں قائم کیں۔ انہوں نے اپنی حکومت کے استحکام کے لئے خود مسلمانوں سے بھی لڑائیاں لڑیں اور اپنے رشتہ داروں کا خون بھی بہایا، لیکن مسلم حکمرانوں نے تاج و تخت کے لئے کبھی مسلم اور غیر مسلم کی تفریق پیدا نہیں کی۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے ہندو پاکستان پر مسلمان بن کر حکومت نہیں کی بلکہ بادشاہ بن کر وہ حکمران رہے۔ انہیں برِّصغیر کی سرزمین سے محبت تھی اور اس ملک کو چھوڑنے یا نقصان پہنچانے کا خیال ان کے دل میں کبھی نہیں پیدا ہوا۔ بقول سر ولیم بنٹنک سابق وائسرائے ہند "جو ممالک مسلمانوں نے فتح کئے ان میں وہ رہ پڑے۔ انہوں نے وہاں کے باشندگان کے ساتھ　　　　　کی اور انہیں جملہ حقوق دیئے فاتح اور مفتوح کے منافعے اور ہمدردیاں ایک ہوگئیں۔"

لالہ راجپت رائے کے بیان کے مطابق : "یہ کہنا صحیح نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت ایک غیر ملکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان حملہ آور نسلاً غیر تھے، لیکن ہندوستان میں آباد ہوتے ہی انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا۔" چنانچہ مسلمان یہاں آکر آباد ہوئے اور اسی سرزمین میں انہوں نے مرنا پسند کیا۔

شاہانِ ہندو پاک نے مسلمانوں سے بھی جنگ کی | تاریخ کے پڑھنے والوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ مسلم شاہانِ ہند و پاکستان کے ہندو راجاؤں اور مسلمان حکمرانوں دونوں ہی سے جنگ کی۔ اور جنگوں میں بدعنوانیاں بھی ہوئیں، لیکن جنگ کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ دہلی کی مرکزی سلطنت کو تسلیم کرلیں۔ اس نقطۂ نظر کے ماتحت انہوں نے جہاں ہندو ریاستوں کو شامل کرنے کی کوشش کی، وہاں نہ صرف پورے دکن کی مسلم ریاستوں کو پامال کر دیا۔ بلکہ افغانستان تک کو نہ چھوڑا۔

لیکن جب ہندو یا مسلم حکمرانوں نے سلطنت دہلی کی مرکزیت تسلیم کر کے شاہان ہند کی اطاعت قبول کر لی تو پھر وہ ان کے دوست بن گئے، اور ان کو ان ہی کے علاقہ کی حکمرانی عطا کر دی گئی ۔۔ اور باج گزار ریاستوں میں نہ اسلحہ کی ضبطی کا حکم صادر کیا گیا اور نہ مذہبی امور میں مداخلت کی گئی۔

جنگ میں کشت و خون اور انہدامات | اس سے انکار نہیں کہ کہیں کہیں مندر بھی ٹوٹے اور ہندوؤں کی جانیں بھی گئیں، مگر کن موقعوں پر ۔۔؟ جنگ کے زمانے میں امن کے زمانے میں ہرگز کوئی مندر نہیں توڑا گیا، اور نہ ہندو قتل کیا گیا۔ جنگ میں کشت و خون اور انہدامات ہوا ہی کرتے ہیں۔

کیا اس سے کوئی انکار کرنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ گجرات میں جین اور برہمن ایک دوسرے کے دشمن نہ تھے، اور دونوں فرقے آپس میں کشت و خون اور ایک دوسرے کے عبادت خانوں کو مسمار نہیں کرتے تھے ۔۔؟ کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ بودھ مذہب کے پیروؤں نے ہندوؤں کے عبادت خانوں کو مسمار نہیں کیا ۔۔؟

شنکر اچارج نے ہزاروں بودھ مت والوں کو تہ تیغ اور اس کے معابد کو ملیامیٹ نہیں کر ڈالا ۔؟ کیا راجہ رام چندر نے لنکا کو جلا کر سیاہ نہیں کر دیا ۔؟

این گناہیست کہ در شہر شما کنند

جناب تلسی رام صاحب لکھتے ہیں:

"جب لنکا فتح ہوا تو اس کی تاخت و تاراج سے بے انتہا سونا، چاندی، جواہرات حاصل ہوئے ۔ قیدیوں میں سے ہر ایک نبرد آزما کے حصہ میں کئی کئی مرد عورت آئے پھر اس شہر کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا گیا۔ بہت سے شودر خاندان ان مفتوح عورتوں کی اولاد ہیں، جو فاتحوں سے پیدا ہوئے ۔ (واقعات ہند ذکر مہاراجہ رام چندر جی)

لالہ بابو رام لکھتے ہیں:

"سنہ عیسوی ۷۷ ۵ برس پیشتر مہاراجہ بکرم نے جس کو بیر بکرماجیت کہتے ہیں، ظہور پایا اور بڑا عالی شان راجہ مہاراجہ ہوا کشمیر وغیرہ تک اپنی عمل داری کر لی اور بدھ مت والوں کو قتل کر ڈالا، اور بالکل نیست و نابود کر دیا۔ (مختصر سیر گلشن ہند ص ۱۲)

بابو شیو پرشاد لکھتے ہیں:

"برہمنوں نے بودھ راجاؤں کو دیدہ ذات، اور دوا کسی ٹھہرا کر بودھوں کا نام تک لکھنا بھی پوتھیوں میں لازم نہیں سمجھا، اور اسی طرح بودھ کے مذہب والے مورخوں نے

برہمنوں کے راجاؤں کا تذکرہ اپنی کتابوں میں قلم بند کرنا فضول اور بے مصرف جانا۔
بودھ مذہب والوں نے برہمنوں کی کتابیں خاک میں ملائیں اور برہمنوں نے بودھ والوں
کی پوتھیاں غارت کر ڈالیں۔" (جام جہاں نما، جلد ۲ مطبوعہ ۱۸۶۰ء)

شیو پرشاد صاحب لکھتے ہیں :

بودھ پرست جو رہ گئے تھے، سب ہندوستان سے نکالے گئے یا وید کے
پیرو بنائے گئے۔ بودھ کے متر اور متر اور مندر سب توڑے گئے
اور متر کئے گئے۔ ان کی جگہ پر شیو کی مورت قائم ہوئی۔ ان کلیوں نے بودھوں
کو مار مار کر نکالنا شروع کیا۔ (آئینہ تاریخ نما)

لالہ راجپت رائے تحریر فرماتے ہیں :

"بشپ متر کے وقت میں بودھ مذہب کے ساتھ بہت سختی ہوئی۔"

تاریخ ہند میں لکھا ہے :

"کہا جاتا ہے کہ بشپ متر نے بہت سے بدھ متر و مندر جلائے۔"
"نویں صدی عیسوی میں بودھوں کے مقلد ہند سے جبراً نکال دئے گئے۔"

ٹاڈ راجستان میں لکھا ہے :

"ہندوستان میں جب جین مذہب کی حکومت تھی تو ہندوؤں پر جزیہ لگایا گیا۔"

ٹاڈ راجستان کے حاشیہ پر درج ہے :

۱۸۰ء میں پرمیشور کی مرضی سے ہندوؤں کی حکومت ترشک لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔
ہندوؤں کو جزیہ سے پالا پڑا۔ ہندوؤں پر قوم جین اور دوسروں نے بڑے بڑے تشدد کئے۔ اہل
جین کے جور و ظلم اس قدر بڑھ گئے تھے کہ مہادیو جی کو شنکراچارج کے قالب میں اتار لینا پڑا۔ جینی
مغلوب اور برباد ہوئے۔ شہر بنارس کو جین مذہب سے نجات ملی۔ اندر نے وترا کو قتل کیا، شہر پر
قبضے کئے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر دئے۔ (رگ وید ص ۳۷)

متعصب غیر مسلم اہل قلم کا غلط پراپیگنڈہ یورپ کے بعض متعصب مؤرخین اور اہل قلم ہمیشہ
اپنی تصنیفوں اور تحریروں میں مسلم شاہان ہند و پاکستان کے متعلق بے بنیاد اور جھوٹے واقعات
درج کر کے انہیں ہندوؤں کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے پراپیگنڈے کا یہ
اثر ہوا کہ ہندوستان کے متعصب اور تنگ دل ہندو مصنفین نے بھی ان من گھڑت واقعات کو

جن کا صحیح تاریخ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اپنی کتابوں اور تحریروں میں تذکرہ شروع کر دیا۔ چنانچہ اسکول اور کالج کے نصاب میں ایسے واقعات کثرت سے درج ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں کے دماغ میں یہ بات جم گئی کہ ہندوستان کے سلمان بادشاہ بڑے متعصب اور ظالم تھے اور انہوں نے ہندوؤں پر بڑے بڑے ظلم ڈھائے اور ان کے مذہب کو بہت نقصان پہنچایا۔ ہندو مسلمان نفاق کی ذمہ داری بڑی حد تک یہی نصاب کی کتابیں ہیں جو ہندوستان کے اسکول اور کالج میں پڑھائی جاتی رہیں۔ اس قسم کی کتابوں کے مصنفین کا واحد مقصد یہ ہے کہ مسلم شاہان ہند پر بجا و بے جا حملے کریں اور ان پر تعصب اور بت شکنی کے الزامات لگائیں، تاکہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات پیدا ہوں۔

جناب چوہدری چھوٹو رام (سابق وزیر متحدہ پنجاب) نے اپنے ایک مضمون میں تحریر فرمایا تھا:

"ہندوستان کی تاریخ کی جو کتابیں ہمارے اسکولوں میں مروج ہیں، وہ بڑی غیر مکمل یا غلط پیرایہ میں لکھی گئی ہیں اور ان کے پڑھنے سے ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں ایسا زہر پیدا ہو جاتا ہے جس کا کوئی توڑ ڈھونڈنا مشکل ہے۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں باہمی کشیدگی، تلخی، تعصب، اور تنگ دلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ کتابیں تاریخی واقعات کو ایسے پیرایہ میں بیان کرتی ہیں جیسے کہ مسلمان بادشاہوں کے دل و دماغ، حق نوازی، انصاف پسندی، رعایا پروری اور رواداری کے جذبات سے بالکل خالی تھے، حالانکہ یہ بات غلط ہے۔

(باقی آئندہ)

تحریر: اسرارالرحمان ایم۔اے (طلورو)

حضرت امام اعظمؒ

(۸۰ —— ۱۵۰ھ)

۱۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کا اسم گرامی نعمانؒ تھا۔ آپ ۸۰ھ کو ثابت بن نعمان کے ہاں کوفہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد بزرگوار کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے۔ خیرات الحسان کے مصنّف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۷ پر لکھا ہے کہ بچپن میں امام صاحب کے والد ثابت بن نعمان، حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کی خدمت میں لائے گئے جنہوں نے ان کے حق میں دعائے خیر و برکت فرمائی۔

۲۔ علمائے امت کا خیال ہے کہ حضرت علیؓ کی دعا دربارِ الٰہی میں مقبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ثابت کے گھر میں علم و تقویٰ کا وہ چراغ روشن کیا جس کے انوار سے ایک دنیا منوّر ہوگئی۔

۳۔ عام مؤرخین کی رائے میں امام ابوحنیفہؒ ایرانی النسل تھے، کیونکہ ان کے جدِ امجد ایران سے کوفہ میں وارد ہوئے۔ خطیب بغدادی اپنی کتاب میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے دو پوتوں کی روایتیں نقل فرمائی ہیں۔ اُن میں سے عمرؒ بن حمادؒ کا خیال ہے کہ اُن کا جد بزرگوار "ماہ" تھا جو کابل سے کوفہ آیا اور دوسرے اسماعیلؒ کی رائے ہے کہ ان کے دادا کا نام المرزبان تھا اور یہ کہ وہ فارس سے تشریف لائے تھے۔ یہ دونوں روایتیں خیرات الحسان کے صفحہ ۲۶ پر موجود ہیں۔

۴۔ حضرت مولانا شبلیؒ نے اپنی کتاب سیرۃ نعمان کے صفحہ ۱۷ پر لکھا ہے کہ مرزبان فارس میں سردار کو کہا کرتے تھے اور "ماہ" عربی لفظ "مہ" کی عربی شکل ہے، اس لفظ کے معنی بھی رئیس اور سردار کے ہیں۔

۵۔ حضرت امام اعظمؒ کے دونوں پوتوں کے اقوال میں ہم یوں تطبیق کر سکتے ہیں کہ اُن کے جدِ امجد کا نام المرزبان یا ماہ تھا جو افغانستان سے فارس اور پھر فارس سے کوفہ تشریف لے گئے تھے۔

۶۔ جناب مولانا سید محمد امین خوگیانی قاضی القضاۃ، سابق افغانستان کی تحقیق کے مطابق حضرت

امام اعظمؒ کے جد بزرگوار ولایت کابل کے درۂ استرغج میں پیدا ہوئے تھے۔

۷۔ اگر ہم اس بات پر یقین کریں کہ حضرت امام اعظمؒ کے آباؤ اجداد افغانستان کے رہنے والے تھے۔ تو پھر اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ حضرت امام اعظمؒ بلحاظِ قومیت افغان تھے۔

۸۔ حضرت امام صاحب کی عمر سولہ سال تھی کہ آپ کے والد ماجد وفات پا گئے۔ اس زمانہ میں سلیمان بن عبدالملک کی حکومت تھی۔ ولید ۹۶ھ میں اس دارِ فانی سے رحلت کر گئے تھے۔

۹۔ سلیمان بن عبدالملک نے حجاج بن یوسف کے مقرر کردہ جرنیلوں کے ساتھ عدل و انصاف کا سلوک روا نہ رکھا بلکہ انہیں معزول کر کے طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ قتیبہ بن مسلّم، طارق بن زیادؒ، موسیٰ بن نصیرؒ اور فاتح ہند محمد بن قاسمؒ کے خونِ ناحق کا داغ سلیمان بن عبدالملک کے دامن پر ہے۔

۱۰۔ ہائے مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا خوب فرمایا تھا۔ سبحان اللہ کاروبارِ عالم کی بوالعجبی، اور جہانِ ہزار رنگ کی بوقلمونی! یہ ہے خدمتِ انسانی کا وہ مزد و صلہ جو دنیا نے ہمیشہ اپنے غمگساروں کو دیا ہے۔

۱۱۔ بہرحال اس تاریخی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلیمان بن عبدالملک کے دور میں علم و ادب نے کافی ترقی کی۔ سلیمان نے ۹۹ھ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ لیکن اپنی وفات سے قبل انہوں نے ایک پاکباز متقی انسان کو اپنا جانشین بنایا، یہ نیک اور دیانتدار آدمی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تھا۔

۱۲۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانۂ اقتدار میں دینی علوم کا ایسا چرچا ہؤا کہ حضرت امام صاحب کے دل میں حصولِ علم کی چنگاریاں جاگ اٹھیں۔ حسنِ اتفاق سے ایک دن آپ کی ملاقات علامہ شعبیؒ سے ہوئی، یہ بزرگ آدمی کوفہ کے ممتاز علمائے دین اور قضاۃ میں سے تھے۔ آپ نے حضرت امام صاحبؒ کو تحصیلِ علم و ادب کی ترغیب دی۔ حضرت موصوف نے اپنی والدہ صاحبہ کی اجازت سے اس دعوت کو قبول کیا۔

۱۳۔ ابتداء میں آپ نے علم کلام پڑھا لیکن بعد میں فقہ کیطرف متوجہ ہوئے۔ کوفہ میں اُن دنوں علم فقہ کے مانے ہوئے استاد حضرت حمادؒ تھے۔ حضرت حمادؒ مشہور و معروف عالمِ دین حضرت ابراہیم نخعی کے حلقۂ درس سے مستفیض ہوئے تھے۔ صاحب ترجمان السنہ نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۲ پر تحریر فرمایا ہے کہ جناب حماد صاحبؒ کو اپنے ذہین شاگرد سے بڑی محبت تھی اور انہیں ہمیشہ اگلی صف میں بٹھایا کرتے تھے۔

۱۴ حضرت امام صاحبؒ کو بہت جلد احساس ہؤا کہ علم فقہ کی تکمیل، علم حدیث کے حصول کے بغیر

ممکن نہیں، فقہی مسائل میں توان کی پیاس حضرت حماد کی محفل میں بجھ سکتی تھی لیکن علم حدیث کا شوق فراواں ادھر پورا ہوتے دکھائی نہیں دیتا تھا۔

۱۵۔ حضرت مولانا سید محمد امین الحق صاحب طوروی اپنی کتاب "السہم الحدید فی نحر العنید" کے صفحہ ۱۲ پر تحریر فرماتے ہیں: "ذہبی لکھتے ہیں: ابوحنیفہؒ سب سے بڑے امام عراق کے فقیہہ نعمان بن ثابت کوفی ۸۰ھ میں پیدا ہوئے اور انس بن مالکؓ صحابی کو آپ نے کوفہ میں کئی بار دیکھا ہے، عطاء ابن ابی رباح، نافع بن عبدالرحمان بن ہرمز عدی بن ثابت، سلمہ بن کہیل، عمرو بن دینار، محمد بن علی قتادہؒ، ابی اسحاقؒ اور بڑی جماعت محدثین علم حدیث میں آپ کے اساتذہ ہیں" ——

آگے فرماتے ہیں: اور وکیع بن جراحؒ، یزید بن ہارونؒ، سعد بن الصلتؒ، ابوعاصم، عبدالرزاقؒ، عبیداللہ بن موسیٰؒ، ابونعیمؒ، ابوعبدالرحمان مقریؒ اور بڑی تعداد علم حدیث میں آپ کے تلامذہ ہیں۔"

۱۶۔ اوپر کا اقتباس نقل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض حضرات کو یہ غلط فہمی ہے کہ امام ابوحنیفہؒ صرف علم فقہ میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور فن حدیث میں اُن کا کوئی مقام نہیں۔

۱۷۔ جب حضرت امامؒ کو علم حدیث حاصل کرنے کا شوق ہوا تو انہوں نے کوفہ کے ممتاز علمائے حدیث کی صحبت اختیار فرمائی۔ اُن دنوں میں کوفہ علوم دینیہ کا مرکز تھا۔ کوفہ میں حضرت امام شعبیؒ جیسے فاضل وکامل موجود تھے۔ حضرت امام نے اُن سے بھی فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد آپ بصرہ چلے گئے اور حضرت قتادہؒ اور امام شعبہؒ سے اکتساب کیا جو سفیان ثوریؒ کے خیال میں فن حدیث کے امیر المؤمنین تھے۔

۱۸۔ حضرت امام صاحبؒ کی ذہانت و فطانت نے ان کو ہمیشہ اپنے حلقہ درس میں امتیازی مقام بخشا۔ فن حدیث کے امیر المؤمنین یعنی جناب شعبہؒ اُن کی عدم موجودگی میں اکثر ان کی تعریف فرمایا کرتے تھے۔

۱۹۔ ایک دن امام شعبہؒ نے ارشاد فرمایا کہ جسطرح مجھے سورج کے روشن ہونے پر یقین ہے۔ اسی طرح میں علم اور ابوحنیفہؒ کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھتا۔

۲۰۔ علم کی پیاس بجھانے کے لئے حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حرمین کا سفر بھی اختیار کیا اور اس طرح مکہ میں آپ کو حضرت عطا بن ابی رباحؒ کی ملاقات نصیب ہوئی جنہوں نے دوسو تک صحابہ کرامؓ دیکھے تھے۔ حضرت عطاؒ کے علاوہ آپ نے حضرت عکرمہؒ سے بھی استفادہ کیا۔

۲۱۔ یہاں سے آپ مدینہ منوّرہ تشریف لے گئے اور حضرت سلیمانؒ اور سالم بن عبداللہ جیسے

اکابرین کے دیدار کا شرف حاصل کیا۔ حضرت سلیمان، ام المومنین حضرت میمونہؓ کا غلام تھا، اور ثانی الذکر سیدنا عمر فاروقؓ کا پوتا ۔۔۔ آپ دونوں مدینہ منورہ کے اُن سات علمائے کرام میں سے تھے جنہوں نے دینی مسائل کی تحقیق کے لئے مشترکہ طور پر ایک کمیٹی بنائی تھی۔

۲۲۔ مدینہ منورہ میں حضرت امام صاحب، امام باقرؒ، امام جعفرؒ، اور زید بن علیؒ کی صحبتوں سے بھی مستفیض ہوئے۔

۲۳۔ حضرت مولانا الحاج سید محمد اسماعیل طوروئیؒ اپنی ایک غیر مطبوعہ یادداشت میں تحریر فرماتے ہیں: "امام ابوحنیفہ لیس نزد بعض تابعی انہ قال فی التجنیس والمزید صح ان اباحنیفۃ کان من التابعین"۔ شیخ الاسلام ابن حجرؒ نے اپنی کتاب الخیرات الحسان کے صفحہ ۲۱ پر لکھا ہے کہ آپ نے کوفہ میں صحابہ کرام کی زیارت کی تھی۔ "اِنّہٗ کَانَ اَدْرَکَ جَمَاعَۃً من الصحابۃ کانوا بالکوفۃ۔"

۲۴۔ ان اقوال کی روشنی میں ہم بڑے وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے جلیل القدر امام صاحبؒ تابعی تھے اور ان کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم نشینوں کی ملاقات نصیب ہوئی تھی، مولنٰنا سید امین الحق صاحب طوروی اپنی کتاب "السہم الحدید فی نحر العنید" کے صفحہ ۶ پر رقمطراز ہیں:
"اور بقول شمس الدین ذہبیؒ بار بار حضرت انسؓ سے امام ابوحنیفہؓ ملے ہیں۔"

۲۵۔ حضرت امام صاحبؒ نے حضرت حماد کی زندگی ہی میں درس و تدریس اور مفتی کے فرائض اپنے استاد کی غیر حاضری میں ادا کئے تھے۔ جب ۱۲۰ھ میں حضرت حمادؒ وفات پا گئے تو اتفاق رائے سے اُن کی مسند پر امام ابوحنیفہؒ بٹھائے گئے۔

۲۶۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ بڑے اطمینان اور کمال استقلال کے ساتھ درس و تدریس کرتے رہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ تدوین فقہ کا مشکل کام بھی شروع فرمایا۔ تھوڑی مدت میں اطراف واکناف میں آپ کے علم کی شہرت پھیل گئی اور گروہ در گروہ لوگ آپ کی ضیا پاشیوں سے مستنیر ہوتے رہے۔

۲۷۔ تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک مرتبہ مدینہ منورہ سے باہر بقیع کے مقام پر حضرت امام مالکؒ کے درس میں شریک ہوئے تھے۔ آپ نے امام صاحب کی بڑی عزت کی اور ان کے ساتھ امتیازی سلوک فرمایا۔ بعض روایات سے یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت امام مالکؒ، امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ مگر اس امر میں بعض حضرات کلام کرتے ہیں۔

۲۸۔ رفتہ رفتہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت عوام و خواص کی توجہ کا مرکز بن گئی اور جب بھی آپ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے مکہ معظمہ جاتے تو جوق در جوق لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے حج کے موقع پر دور دراز کے علمائے کبار سے آپ کی ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اور اس طرح خیالات و افکار میں توسیع ہوتی رہی۔

۲۹۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ ایک باوقار اور بااثر دینی شخصیت کے مالک تھے اور سیاست سے عملی طور پر الگ تھلگ رہنے کے باوجود ملکی معاملات میں آپ کا بہت اثر و نفوذ تھا۔ جس وقت کوفہ میں حضرت زید بن علیؒ نے علوی تحریک میں از سر نو جان ڈال دی اور پندرہ ہزار کوفیوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تو کہتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ نے ان کی مالی اعانت فرمائی تھی۔ اور ان کے خروج کو باعث ثواب قرار دیا تھا۔ بہرحال یہ تحریک بہت جلد ناکام ہوگئی اور حضرت زیدؒ شہید کر دئے گئے۔ اہل کوفہ نے اپنی روایات کے مطابق وعدہ خلافی کے آئین پر عمل کیا اور خروج کے وقت حضرت زیدؒ کی پشت پر پندرہ ہزار "جانبازوں" میں سے صرف ۲۱۸ آدمی رہ گئے تھے۔

۳۰۔ مروان کے ایک گورنر ہبیرہ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کو بعض مصلحتوں کی بنا پر قضا کا عہدہ پیش کیا لیکن آپ نے عہدہ قبول کرنے سے انکار کیا۔ امام صاحبؒ نہیں چاہتے تھے کہ ایک غلط قسم کی حکومت میں شامل ہو جائیں۔ گورنر ہبیرہ نے حضرت امام صاحب کو عدول حکمی کی پاداش میں قید کی سزا دے دی اور بعض روایات کے مطابق کوڑے لگوائے۔

۳۱۔ خلیفہ منصور کے دور اقتدار میں خاندان علیؓ پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے۔ محمد ابراہیمؒ جو حسن و جمال میں غیرت ماہ و خورشید تھے اور حسن اخلاق اور خوبیٔ کردار میں یگانۂ روزگار تھے۔ ان کو بڑی بے دردی کے ساتھ شہید کیا گیا۔ اس دور میں محمد بن مہدی بن عبداللہ نفس ذکیہ کی تحریک کی آگ سلگ رہی تھی۔ اور اسلامی دنیا میں ان کے حامی پھیل گئے تھے۔ کہتے ہیں حضرت امام مالکؒ نے نفس ذکیہؒ کے حق میں فتویٰ دیا تھا۔ ۱۴۵ھ میں نفس ذکیہؒ نے خروج کیا۔ لیکن بہت جلد آپ شہید ہو گئے۔ اب قیادت ان کے بھائی ابراہیمؒ نے سنبھالی۔ خلیفہ منصور بغداد سے کوفہ آ گئے۔ اس دور میں حضرت امام ابوحنیفہؒ برملا ابراہیمؒ کی حمایت کرتے رہے۔

۳۲۔ سب سے زیادہ خطرناک کام امام صاحبؒ نے یہ کیا کہ منصور کے سالار اعظم حسن بن قحطبہ کو ابراہیمؒ کے مقابلے سے روک لیا۔ جب ابراہیم بن عبداللہ جنگ بصرہ میں شہید ہو گئے تو منصور

ان کی حمایت کرنے والوں کی خبر لینے لگے۔

۳۳۔ خلیفہ منصور نے حضرت امام اعظمؒ کو بغداد بلایا۔ اور ان کی خدمت میں قاضی القضاۃ کا عہدہ پیش کیا۔ حضرت امام صاحبؒ نے معذرت چاہی۔ لیکن خلیفہ منصور نے طیش میں آکر آپ کو جیل بھیج دیا۔

۳۴۔ قید خانہ میں حضرت امام صاحبؒ کو درس و تدریس کی اجازت تھی۔ بغداد کے علمی حلقوں میں حضرت امام صاحبؒ کی شہرت میں اضافہ ہوتا رہا اور عوام الناس میں آپ کے ہمدردوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ یہ بات اربابِ اقتدار کو کھٹکتی تھی۔ اس لئے ان کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق وہ چیز پلائی گئی جو حیاتِ فانی کی دشمن ہے۔ قاضی حسن بن عمارؒ نے آپ کو غسل دیا اور خیزران کے مقبرہ نے آپ کو اپنی گود میں جگہ دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

۳۵۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ نے ستر سال کی عمر پائی تھی۔ آپ ایک زبردست فقیہہ اور مقنّن تھے۔ آپ کا عظیم کارنامہ فقہ حنفی کی تدوین ہے۔ اس مقصد کے لئے آپ نے چالیس علماء کی ایک جماعت مقرر فرمائی تھی۔ ان علمائے کرام نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی سرپرستی میں مل کر ۲۹ سال تک کام کیا۔ اور حکومتِ وقت کے دباؤ سے آزاد ہو کر جمہوری اور شورائی طریقے سے تدوینِ قانون کا بوجھ اٹھایا۔ ان کا یہ کارنامہ رہتی دنیا تک مثال رہے گا۔

۳۶۔ حضرت امام صاحبؒ بڑے نیک، پاکباز، متقی، حق گو، مخلص، نڈر، اور مستقل مزاج انسان تھے، آپ کے پاس دولت کی کمی نہ تھی، بڑے فیاض اور باوقار عالم تھے۔ خدا تعالیٰ ہمیں اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ ■■

لَا يَمْنَعُ الْكُفْرُ بِتَكْفِيْرِ اِلَّا نَّهٗ مُكَذِّبٌ لِهٰذَا النَّصِّ الَّذِيْ اَجْمَعَتِ الْاُمَّةُ اَنَّهٗ غَيْرُ مُأَوَّلٍ وَّلَا مَخْصُوْصٍ۔ (الانتقاد)

روک نہیں سکتا۔ اُمّت متفق ہے کہ اس میں تاویل و تخصیص نہیں۔

اسی طرح تمام کتب تفاسیر میں یہی معنی خاتم النبیّین کے بیان ہوئے ہیں اور چونسٹھ صحابہ سے یہی معنی ختم النبوّت فی الآثار میں منقول ہے۔

(باقی آئندہ)

نگاہِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

بر یکے از ظلوم وجہول

حضرت مولانا قاضی عبد الکریم صاحب - کلاچی

نگاہے یارسول اللہ نگاہے ! — پیاپی خواہم از حرماں پناہے
اگر یک لحظہ زیں محروم مانم — ہماں لحظہ شوم گم کردہ راہے
نشانے کز نگاہت پاک بینم — ہمیں ایمان و درد و سوز و آہے
اگر یک لحظہ گردد غیر چشمت — شود بعدم ز حق صد سالہ راہے
ازیں خواہم ز تو ہر صبحگاہے — نگاہے یارسول اللہ نگاہے
پریشانم ز دست نفس و شیطان — نگاہے خواہم ای رحمت پناہے
ہمی خواہم بخاک پاک طیبہ — بمالم چشم خود شام و پگاہے
رفیقان بارہا آں نور دیدہ — منم از بخت خود چشمم براہے
نگاہِ نازنیناں بس غنیمت — وے فرقے نگاہے تا نگاہے
زکفرم وارہانیدہ نگاہے — نگاہے بوبکرؓ را کرد ماہے
ازیں فرق نگاہ گفت عارفؒ — پیاپی گر نباشد گاہ گاہے
چہ رحمت گر بہ ایں مسکیں گدائے — کشائی چشم خود بہر نگاہے
نگاہِ لطف تو چوں باز بینم — نہم پا بر سرِ جمشید جاہے
کجا خود شکر ایں نعمت گذارد — گدایت، ای جہاں را بادشاہے
زمن ہر دم گناہے بر گناہے — ز تو ہر دم نگاہے بر نگاہے
ز بہر والدین و بہر استا — نگاہے خواہم ای رحمت نگاہے
ندیم پُر گناہ دیگر چہ خواہد — نگاہے یارسول اللہ نگاہے